جہاد فی سبیل اللہ

دین کی اہم اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی اصل حقیقت،
اس کے مراحل و مدارج اور اس کی فرضیت ولزوم کے ضمن میں

بانی تنظیم اسلامی وصدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ایک جامع خطاب

☆

شائع کردہ:

تنظیم اسلامی

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54000
فون: 36293939,36316638,36366638 فیکس: 36313131
ای میل: markaz@tanzeem.org www.tanzeem.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں جہاں بحیثیت اُمت ہمارے اندر عملی واخلاقی زوال آیا وہاں دینی تصورات اور اصطلاحات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ دینی تصورات میں محدودیت در آئی، بعض اہم دینی اصطلاحات چیستان بن کر رہ گئیں بلکہ بنا کر رکھ دی گئیں ـــــ ان دینی اصطلاحات میں ایک نہایت اہم اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی ہے جس کے ساتھ اغلباً سب سے بڑھ کر ظلم ہوا ہے۔ اس انتہائی جامع اور ہمہ گیر دینی اصطلاح کو نہ صرف یہ کہ بہت ہی محدود معنوں میں مقید کر دیا بلکہ نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں ''فساد فی الارض'' پر مشتمل ہوس ملک گیری کے لیے کی جانے والی قتل وخون ریزی کو بھی اس مقدس اصطلاح کا جامہ اوڑھا کر اس کی رسوائی کا سامان کیا گیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے حوالے سے معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات اور مغالطّوں کو دور کر کے اس مقدس اصطلاح کے حقیقی اور جامع مفہوم کو عام کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے، جو تحریک رجوع الی القرآن کے داعی ہی نہیں، غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد جس کا دوسرا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے، میں بھی اللہ کے فضل وکرم اور توفیق سے عملی طور پر سرگرم ومشغول ہیں، بارہا اپنے خطبات وتقاریر میں جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت کو واضح اور مدلل انداز میں بیان فرمایا اور اس کی مختلف سطحوں پر عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ آج کل چونکہ جہاد افغانستان وکشمیر کے حوالے سے بھی ''جہاد'' کا بہت چرچا ہے اور بعض مفاد پرست عناصر اس لفظ کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل اور اس مقدس اصطلاح کو بدنام کرنے کے درپے ہیں، لہٰذا چند ماہ قبل ستمبر ۱۹۹۹ء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں اس موضوع پر ایک مبسوط خطاب فرمایا اور اس کے حوالے سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور مغالطّوں کا ازالہ کیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب اوّلاً میثاق نومبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں شائع کیا گیا اور اب اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کی سعادت مرکزی انجمن کو حاصل ہو رہی ہے۔

ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

عنوانات

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں مغالطے 6
① کیا جہاد اور قتال مترادف ہیں؟ 6
② جہاد فرضِ عین یا فرضِ کفایہ؟ 8
③ کیا مسلمان کی ہر جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے؟ 9
جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت ولزوم 11
① جہاد: ایمان حقیقی کا جزوِ لازم 11
② اُخروی نجات کا لازمی تقاضا 14
جہاد اور قتال کا فرق 14
جہاد کی لغوی بحث 16
''جہاد'' بطور اصطلاح 17
جہاد کی منزلیں 19
① جہاد فی سبیل الحیاۃ 19
② جہاد فی سبیل الحقوق 20
③ نظریہ اور نظام کی سطح پر جہاد 21
جہاد فی سبیل اللہ کی منازل 23
① پہلی منزل کے تین جہاد 23
(i) جہاد مع النفس 23
(ii) شیطانِ لعین اور اس کے غیر مرئی لشکر کے خلاف جہاد 26
(iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد 27
② باطل نظریات کے خلاف جہاد 28
دعوت وتبلیغ 31
قرآن بحیثیت آلۂ جہاد 40

۳ جہاد کی بلند ترین منزل ''اقامت دین'' 45

اقامت دین کی شرطِ لازم: منظّم جماعت 46

اقامت دین کے مراحل 49

۱ صبرِ محض 49

۲ اقدام 51

۳ تصادم 52

موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا متبادل 54

مقتول فی سبیل اللہ کا مقام 55

نظم جماعت کی مسنون اساس: بیعت سمع وطاعت 57

دو اہم باتیں 60

جہاد فی سبیل اللہ

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ...... ﴿۱۴﴾﴾ (الحجرات)

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحجرات)

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ (الصف)

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾﴾ (الصف)

وَعَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم **((اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ، بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))** (۱)

وَعَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم **((اَلْجِھَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰہُ اِلٰی اَنْ یُّقَاتِلَ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ الدَّجَّالَ))** (۲)

معزز حاضرین ومحترم خواتین! آج کی اس نشست میں ☆ ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ کے

نوٹ: احادیث کے مکمل حوالہ جات کتابچے کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ستمبر 1999ء قرآن آڈیٹوریم لاہور

مرکزی عنوان کے تحت تین ذیلی عنوانات زیر گفتگو آئیں گے:

۱) جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں خود اپنوں کو اور غیروں کو کیا مغالطے لاحق ہو گئے ہیں؟

۲) جہاد فی سبیل اللہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے مراحل اور لوازم کیا ہیں؟

۳) اس کی فرضیت اور لزوم کا کیا معاملہ ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں مغالطے

ہمارے دین میں عام طور پر جو ترتیب ملتی ہے وہ پہلے نفی اور پھر اثبات ہے۔ چنانچہ کلمۂ طیبہ میں بھی پہلے نفی ہے، پھر اثبات ہے "لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"۔ اسی طرح آیت الکرسی کے بعد والی آیت میں الفاظ آئے ہیں:

﴿فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ......﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

"پھر جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لایا......"

اسی حوالے سے میں پہلے مغالطوں کے بارے میں گفتگو کروں گا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں کون سے مغالطے ہیں جو اوّلاً خود مسلمانوں کو لاحق ہوئے، لیکن پھر ان پر دشمنانِ اسلام نے اسلام کی رسوائی اور بدنامی کی بنیاد کھڑی کر دی۔ ظاہر بات ہے کہ دشمنوں کا معاملہ تو فارسی کے اس شعر کے مصداق ہے۔

نیش عقرب نہ از پئے کین است!
اقتضائے طبیعتش این است!

یعنی بچھو کا ڈنگ مارنا کسی کینے یا دشمنی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ تو دشمنوں کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اسلام پر حملے کریں۔ لیکن اگر ہم نے خود اس کے لیے بنیاد فراہم کر دی ہو تو پہلے ہمیں اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہیے۔

① کیا "جہاد" اور "قتال" مترادف ہیں؟

جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں سب سے بڑا مغالطہ، جو بہت عام ہے اور صرف عوام ہی میں نہیں، خواص یعنی علماء کو بھی لاحق ہے، یہ ہے کہ "جہاد" کے معنی "جنگ" کے ہیں۔ گویا

کہ ''جہاد'' کو ''قتال'' کے مترادف باہم معنی قرار دے دیا گیا ہے۔ غور طلب بات ہے کہ لسانیات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کسی بھی زبان کے دو الفاظ بالکل ایک مفہوم کے حامل نہیں ہوتے۔ اس سے آگے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور ''قتال فی سبیل اللہ'' قرآن مجید کی دو مستقل اصطلاحیں ہیں، جو قرآن کریم میں متعدد بار استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الصّف چودہ آیات پر مشتمل ایک چھوٹی سی سورۃ ہے اور اس میں یہ دونوں اصطلاحات آئی ہیں۔ اس کی آیت ۴ میں ''قتال فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح بایں طور آئی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

آگے آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا:

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے''۔

چنانچہ ان دونوں اصطلاحوں کو مترادف قرار دے دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ یہ دونوں الفاظ بعض اوقات ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ اس طرح استعمال ہوئے ہیں، اس کی مثالیں آگے آئیں گی، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جانی چاہیے کہ یہ دونوں قرآن کی مستقل اصطلاحات ہیں۔

قرآن حکیم کی بنیادی اصطلاحات میں سے دو دو اصطلاحات کے تین جوڑے ایسے ہیں کہ جن کے مابین 'خاص' اور 'عام' کا رشتہ ہے۔ مثلاً ''مؤمِن'' اور ''مُسلِم'' بظاہر مترادف الفاظ ہیں کہ ایک ہی شخص کے لیے دونوں الفاظ کا استعمال ہو سکتا ہے، لیکن ''مسلم'' عام اصطلاح ہے اور ''مؤمن'' خاص۔ یعنی ہر ''مؤمن'' تو لازماً ''مسلم'' ہے، لیکن ہر مسلم لازماً ''مؤمن'' نہیں ہے۔ چنانچہ آج جن آیات کے حوالے سے حقیقت جہاد اور اس کی فرضیت ولزوم کے ضمن میں گفتگو کی جائے گی ان میں بعض وہ آیات بھی ہیں جن میں ان

دونوں اصطلاحوں (مؤمن اور مسلم) کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔اسی طرح اصطلاحات کا ایک اور جوڑا 'نبی' اور 'رسول' ہے۔ 'نبی' اور 'رسول' میں کئی اعتبارات سے فرق کیا جاتا ہے، لیکن یہ بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ نبی 'عام' ہے اور رسول 'خاص'۔یعنی ہر رسول، تو لازماً نبی ہے، لیکن ہر نبی، لازماً رسول نہیں ہے۔ 'جہاد' اور 'قتال' میں بھی بالکل یہی رشتہ ہے کہ ان دونوں میں عُموم اور خُصوص کی نسبت ہے۔ان میں جہاد عام ہے اور قتال خاص ہے، یعنی ہر قتال تو لازماً 'جہاد' ہے، لیکن ہر جہاد لازماً 'قتال' نہیں ہے۔ان تینوں جوڑوں کے بارے میں اہلِ علم نے بہت عمدہ اصول وضع کیا ہے ''اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اِجْتَمَعَا'' یعنی جب کسی ایک جگہ پر یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئیں گے تو یقیناً ان میں بہت بڑا فرق ہوگا Simultaneous Contrast لیکن جب یہ الگ الگ استعمال ہوں گے تو ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوں گے۔چنانچہ اگر ایک ہی جگہ مسلم اور مؤمن کے الفاظ آ رہے ہوں تو ان کے مفہوم میں لازماً فرق ہوگا۔اسی طرح اگر ایک ہی جگہ جہاد اور قتال کے الفاظ آئیں، جیسا کہ سورۃ الصّف کی مثال دی گئی ہے، تو لازماً فرق ہوگا۔لیکن اگر دونوں علیحدہ علیحدہ استعمال ہو رہے ہوں تو یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو سکتے ہیں، یعنی نبی کی جگہ رسول اور رسول کی جگہ نبی، اسی طرح جہاد کی جگہ قتال اور قتال کی جگہ جہاد، اور مؤمن کی جگہ مسلم اور مسلم کی جگہ مؤمن کے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ (لہٰذا کسی مقام پر ان میں سے کسی اصطلاح کا حتمی مفہوم متعین کرنے کیلئے) اس فرق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

۲ جہاد فرضِ عین یا فرضِ کفایہ؟

جب قتال اور جہاد کو مترادف قرار دے دیا گیا اور جہاد کے معنی جنگ بنا لیے گئے تو اب ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کے مصداق اس مفروضے پر مبنی نتائج بھی غلط نکلے۔اگر جہاد کا مطلب قتال ہے تو ظاہر بات ہے کہ قتال تو ہر وقت نہیں ہوتا اور قتال کے بارے میں یہ بھی طے ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے اِلّا یہ کہ کوئی استثنائی صورت ہو جائے جیسے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیر عام کا اعلان کیا گیا کہ

ہر شخص جنگ کے لیے نکلے۔ گویا عام حالات میں قتال فرضِ عین نہیں ہے بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ مثلاً اگر کسی مہم کے لیے سو آدمیوں کی ضرورت ہے اور سو آدمی نکل آئیں تو باقی مسلمانوں کی طرف سے فرض ادا ہو گیا یا جیسے ہمارے ہاں نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے کہ کچھ لوگوں نے ادا کر لی ہے تو سب کی جانب سے ادا ہو جائے گی اور اگر کسی مسلمان کی نماز جنازہ کسی نے بھی ادا نہ کی تو سب گنہگار ہوں گے۔ یہی معاملہ قتال کا ہے۔ جیسے خلافت راشدہ میں ہوتا تھا کہ اگر شام کے محاذ پر جنگ ہو رہی ہے اور وہاں سے مطالبہ آیا کہ دس ہزار آدمیوں کی ضرورت ہے تو اگر دس ہزار مجاہدین نکل آئے تو باقی سب آرام سے گھروں میں رہیں ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔

جہاد اور قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود جہاد کو فرضِ عین کی بجائے فرضِ کفایہ سمجھ لیا گیا۔ اس کے نتیجے میں جہاد کا تصور ہمارے دینی تصورات سے بحیثیت مجموعی خارج ہو گیا اور اس کی کوئی اہمیت نہ رہی۔

③ کیا مسلمان کی ہر جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے؟

ایک دوسری چیز جس نے میرے نزدیک جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور پھر اس کی وجہ سے اصل بدنامی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے، یہ مغالطہ ہے کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس غلط فہمی کے بدترین نتائج نکلے اور اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کو بری طرح بدنام کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے دَورِ ملوکیت میں بادشاہ جو جنگیں کرتے تھے ان کا بڑا مُحرِّک ان کی ہوس ملک گیری ہوتی تھی تاکہ بڑے سے بڑا محل بنا سکیں اور زیادہ سے زیادہ محصولات (Revenues) اکٹھے ہو سکیں۔ لیکن ان جنگوں کو بھی جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں اس مقدس اصطلاح کو تو بدنام ہونا ہی تھا۔

اسی طرح (بیسویں) صدی کے وسط یعنی پچاس کی دہائی میں الجزائر میں فرانس سے آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ حصولِ آزادی کے لیے مسلمانوں کی جنگ ایک جائز جنگ ہے، مگر آزادی کی ہر جنگ 'جہاد فی سبیل اللہ' نہیں ہے۔ لیکن الجزائر کی اس جنگ آزادی کو

جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا۔ یہ میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کر رہا ہوں کہ اُس زمانے میں مَیں جماعت اسلامی منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کا امیر تھا تو علامہ بشیر الابراہیمی الجزائری تشریف لائے اور ان کے ساتھ ایک آرمی افسر کرنل عودہ تھے۔ علامہ بشیر الابراہیمی الجزائری معروف دینی شخصیت تھے۔ انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ پر بڑی جوشیلی تقریر کی، جو عربی میں تھی، لیکن اس کا مفہوم سننے والوں کو کچھ نہ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ ہم نے اپنی بساط بھر کوشش کر کے پیسے جمع کیے اور ان کی خدمت میں پیش کیے۔ لیکن اس ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا نتیجہ کیا نکلا؟ جب وہ جہاد کامیاب ہوا تو وہاں ایک سوشلسٹ ریاست وجود میں آ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جو درخت آم کا تھا اس پر برگ و بار کسی اور شے کے آ گئے۔ درحقیقت وہ جنگ آزادی تھی، جہاد حریت تھا، جہاد فی سبیل اللہ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ کامیابی کی صورت میں وہاں کے ایلیٹ طبقہ کے اذہان، فکر اور نظریات کے مطابق نظام بن گیا۔

یہی حال ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں ہوا۔ افغانستان میں جو جنگ لڑی گئی وہ بھی بنیادی طور پر جہادِ حریت، یعنی آزادی کی جنگ تھی۔ اس میں اصل زور اس وقت آیا جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ اس موقع پر تمام علماء بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس لیے کہ ہمارے فقہی تصورات کی رو سے بھی کسی مسلمان ملک پر غیر مسلم فوجیں حملہ آور ہو جائیں تو پھر دفاع فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس جذبے سے سرشار ہو کر پوری قوم اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے کھڑی ہو گئی۔ ہم نے اس پر بھی جہاد فی سبیل اللہ کا لیبل دے دیا اور دنیا بھر میں اس کا ایسا ڈنکا بجا کہ جذبۂ شہادت سے سرشار نوجوان پوری دنیا سے کھنچ کر چلے آئے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے دل میں وہی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ تھا، لیکن اس کی اصل کیفیت اور نوعیت تو جہادِ حریت کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جہاد فی سبیل اللہ کا یہ نتیجہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال کچھ عرصے بعد عربی مدارس کے نوجوان طالب علم اٹھے جنہوں نے جہاد فی سبیل الامن یعنی امن قائم کرنے کے لیے جہاد کیا۔ چونکہ وہ علماء تھے لہٰذا انہوں نے جن علاقوں کا کنٹرول سنبھالا وہاں اسلامی شریعت نافذ کی اور اس سے امن بھی قائم ہو گیا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت ولزوم

جہاد فی سبیل اللہ ایمانِ حقیقی کا جز ولازم بھی ہے اور نجاتِ اُخروی کا لازمی تقاضا بھی! اس کی اہمیت اور لزوم کے ضمن میں قرآن مجید سے بیسویں آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، لیکن میں یہاں صرف دو مقامات کے حوالے دے رہا ہوں۔

① جہاد: ایمان حقیقی کا جزوِلازم

قرآن حکیم کی رُو سے جہاد فی سبیل اللہ ایمان کا جزوِلازم ہے، جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر ایمان نامکمل ہے۔ ایمان سے یہاں ایمانِ حقیقی مراد ہے۔ اس کے دو لوازم ہیں، ایک دل میں یقین اور دوسرے عمل میں جہاد۔ اس کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ اور ۱۵ ملاحظہ کیجیے۔ آیت ۱۴ کے آغاز میں ایمان اور اسلام کو علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۴)

''یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے تم ایمان ہرگز نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (یا ہم نے اطاعت قبول کر لی) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔

مذکورہ بالا آیت میں اسلام کا اثبات کرتے ہوئے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ اس لیے کہ جس کسی نے زبان سے کہہ دیا ''اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''، وہ قانونی طور پر مسلمان شمار ہوگا۔ لیکن فرمایا گیا کہ اس مغالطے میں نہ رہنا کہ اس سے تمہیں ایمان حاصل ہو گیا ہے بلکہ ابھی تم نے صرف اسلام قبول کیا ہے۔ ''اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا'' کی رو سے ایک ہی جگہ دونوں اصطلاحیں آئی ہیں تو مفہوم جدا ہو گیا۔ چنانچہ یہاں اسلام اور ہے، ایمان اور ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ ایمان اور شے ہے، اسلام اور شے ہے تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایمان کیا ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے لوازم کیا ہیں؟ اس کی شرائط

کیا ہیں؟ اس اعتبار سے سورۃ الحجرات کی یہ دو آیات ایمانِ حقیقی کی تعریف پر قرآن کا ذروۂ سنام ہیں۔ اس لیے کہ اس تمہید کے بعد کہ اسلام اور ہے، ایمان اور ہے، اور یہ کہ تمہارا اسلام تسلیم لیکن تمہارا ایمان کا دعویٰ قابل قبول نہیں، فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴿۱۵﴾﴾

''(حقیقی) مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر ہرگز شک میں نہیں پڑے۔ اور انہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اپنی جانوں اور مال کے ساتھ، صرف یہی سچے لوگ ہیں''۔

نوٹ کیجیے اس آیت کے آغاز میں بھی اور اختتام پر بھی اسلوبِ حصر ہے۔ اسلوبِ حصر کو اس مثال سے سمجھئے کہ ایک جملہ تو یہ ہے کہ ''زید عالم ہے''۔ اس سے ایک مفہوم آپ کے ذہن میں آ گیا کہ زید عالم ہے۔ اب اگر اس جملے میں ''ہی'' کا اضافہ ہو جائے کہ ''زید ہی عالم ہے'' تو اب یہاں گویا باقی کی نفی ہوگئی کہ جس گروہ کا ذکر ہو رہا تھا ان میں سے عالم صرف ایک ہے اور وہ زید ہے، باقی سب عالم نہیں ہیں۔ اس کو اسلوبِ حصر کہتے ہیں۔ ''اِنَّمَا'' کلمۂ حصر ہے اور آخر میں ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ'' میں پھر حصر ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ایمانِ حقیقی کی تعریف کو دو طرح سے حصر کے اندر لے کر بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایمان کی جامع اور مانع تعریف ہے۔

یہ قرآن مجید کا واحد مقام ہے جہاں ایمان کے بعد ﴿ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ کا اضافہ ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایمان مطلوب ہے جو یقین کی شکل اختیار کر گیا ہو، اور یقین بھی ایسا کہ اس کے ساتھ شکوک وشبہات کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایمانِ حقیقی کی پہلی شرطِ لازم تو یہ ہوئی۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

اس بات کو اب ذرا وضاحت سے سمجھئے۔ دیکھئے! اسلام کے پانچ ارکان ہیں جن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ یہ بات میں اس حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے بعض مفسرین

نے، خاص طور پر وہ جو کسی دعوتی جدوجہد کو لے کر کھڑے ہوئے، کوشش کی ہے کہ جہاد کو بھی ارکانِ اسلام میں داخل کر لیں۔ یہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر کیا گیا، لیکن میرے نزدیک یہ کوشش غلط ہے۔ ارکانِ اسلام معین ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ، وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۳)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے (۱) اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) حج کرنا (۵) رمضان کے روزے رکھنا''۔

ان پانچ ارکان میں سے ہم نہ کسی کو کم کر سکتے ہیں، نہ ان میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اسلام عام ہے اور ایمان خاص ہے۔ چنانچہ ''ایمان'' میں یہ پانچوں ارکانِ اسلام تو شامل رہیں گے، یہ اس کا جزوِ لازم ہیں، البتہ اس میں دو کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک یہ کہ ''شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کے ساتھ یقینِ قلبی کا اضافہ اور دوسرے عمل میں جہاد کا اضافہ۔ اس کے بعد ایک مثال یہ ہے کہ روشنی کی کرن جب منشور (Prism) میں سے گزرتی ہے تو اس کے سات رنگ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان سات کے ساتھ دو رنگ اور بھی ہوتے ہیں (Ultra violet اور Infra Red) جو نظر نہیں آتے۔ اسی طرح یہ پانچ ارکان تو رہیں گے۔ ''اسلام'' گویا پہلی منزل ہے جس کے یہ پانچوں ستون ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر بالاتر منزل ''ایمان'' کی ہے، جہاں دو ستون مزید جمع ہو جائیں گے، قلب میں یقین اور عمل میں جہاد۔ یعنی ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایمانِ حقیقی کے سات ارکان ہیں: یقینِ قلبی، شہادتِ لسانی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ۔ بہرحال مذکورہ بالا آیت مبارکہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ ایمانِ حقیقی کا جزوِ لازم ہے۔

۲ اُخروی نجات کا لازمی تقاضا

جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت اور اس کے لزوم کے ضمن میں قرآن حکیم کا دوسرا مقام سورۃ الصّف کی دو آیات ہیں، جن سے بالکل واضح ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات نہیں ہے نہ عذابِ الٰہی سے چھٹکارا ممکن ہے۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾ (الصف)

''اے ایمان کے دعویدارو! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی طرف جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر (جیسے کہ ایمان لانے کا حق ہے) اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم واقعتاً صحیح علم رکھتے ہو''۔

آیت کے آغاز میں ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ ایمان تو پہلے بھی موجود تھا، لیکن اس کے بعد جو یہ فرمایا گیا کہ ''ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر'' تو معلوم ہوا کہ پہلے سے موجود ایمان قانونی درجے کا ایمان تھا اور یہاں حقیقی ایمان کی بات کی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ''جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے''۔ معلوم ہوا کہ ازروئے قرآن جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات کا کوئی امکان نہیں کیونکہ اس آیت میں جہاد کے بغیر نجات کی نفی ہو رہی ہے۔

جہاد اور قتال کا فرق

البتہ ایک بات سمجھ لیجیے کہ یہ معاملہ قتال کا نہیں ہے، بلکہ یہ جہاد کی بحث ہو رہی ہے۔ ''قتال'' کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۹۵ بہت اہم ہے۔ فرمایا:

﴿لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ

وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

''مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں (یعنی قتال نہیں کرتے) اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں (یہاں جہاد کا لفظ قتال کے معنی میں آیا ہے) دونوں کی حیثیت برابر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بہت بڑا درجہ دیا ہے ان لوگوں کے مقابلے میں جو بیٹھے رہنے والے ہیں۔ اور (ان دونوں میں سے) ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑا اجر دیا ہے''۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں صرف غزوۂ تبوک کے وقت نفیر عام ہوئی تھی، اس سے پہلے جتنی جنگیں ہوئیں ان میں صرف تشویق و ترغیب دلائی گئی کہ اے اہل ایمان اللہ کی راہ میں نکلو! اللہ کی راہ میں جہاد کرو! لیکن اسے فرضِ عین قرار نہیں دیا گیا۔ آپ ﷺ کی پوری جدوجہد کے دوران سوائے غزوۂ تبوک کے موقع کے، قتال سب مسلمانوں کے لیے لازم نہیں کیا گیا۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا، اور جب ہو تو عام حالات میں وہ فرضِ کفایہ ہوتا ہے سوائے اس کے کہ نفیر عام ہو۔ چنانچہ قتال فرضِ عین نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی قتال کے لیے نہیں نکلا تب بھی اس کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ہو گیا بلکہ فرمایا ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ ''(ان دونوں میں سے) ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے''۔ لیکن قتال فی سبیل اللہ کے لیے جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکل آنے والوں کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

اس کے مقابلے میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیر عام تھی، لہٰذا اس موقع پر یہ انداز اختیار فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى

الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا﴾ (التوبۃ:۳۹)

''اے اہلِ ایمان! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ نکلو اللہ کی راہ میں (جنگ و قتال کے لیے) تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے۔ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو ترجیح دے بیٹھے ہو؟ (اور اگر تم نے دنیا کی زندگی پسند کر لی ہے) تو جان لو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا ثابت ہو گا۔ اور اگر تم (قتال کے لیے) نہیں نکلو گے تو سن رکھو کہ اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا''۔

یہ دو مقامات میں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جب قتال فرضِ عین بن جائے، یعنی نفیر عام ہو تو اس کی صورت اور ہو گی، ورنہ عام حالات میں قتال فی سبیل اللہ فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے اور اس کیلئے تشویق و ترغیب سے کام لیا جائے گا۔ البتہ جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر نجات کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

''جہاد'' کی لغوی بحث

اب آیئے ذرا لغوی طور پر جائزہ لیں کہ یہ لفظ کہاں سے بنا ہے اور اس نے درجہ بدرجہ ایک اصطلاح کی شکل کیسے اختیار کی ہے۔ ظاہر بات ہے ہمارے دین کی اصطلاحات عربی زبان ہی سے اختیار کی گئی ہیں اور پہلے سے مستعمل الفاظ میں کچھ اضافی معانی داخل کر کے انہیں اصطلاحات کی شکل دی گئی ہے۔ ''جہد'' کے لفظ سے ہر شخص واقف ہے کہ اس کا مادہ ''ج، ہ، د'' ہے۔ جہد کے معانی کسی چیز کے حصول کے لیے محنت اور کوشش کرنے کے ہیں۔ یعنی to strive for something لیکن جب یہ لفظ باب 'مفاعلہ' میں آئے گا (جہاد/مجاہدہ) تو یہاں اب دو طرفہ عمل ہو جائے گا، یعنی جہد کے مقابلے میں جہد، کسی رکاوٹ کے مقابلے میں محنت اور کوشش۔ انگریزی میں اسے to struggle against something کے الفاظ سے تعبیر کریں گے۔ اس کے ساتھ ہمیشہ against کا صلہ (preposition) استعمال کرتے ہیں، جبکہ to strive کے ساتھ for استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ جہد یکطرفہ عمل ہے، آپ کسی کام کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جہاد وہ دوطرفہ

کوشش ہے جبکہ کوئی مقابلے میں ہو، یعنی آپ بھی کوشش کر رہے ہیں تو کوئی دوسرا بھی کوشش کر رہا ہے۔ گویا کوشش کا کوشش سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ کوشش کا کوشش سے تقابل ہو تو یہ جہاد ہے۔ بالکل اسی طرح قتل اور قتال کا معاملہ ہے۔ قتل بالکل یک طرفہ عمل ہے۔ ایک شخص جا رہا تھا کسی نے اس کو گولی مار دی، جبکہ اس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی مجھے گولی مار دے گا۔ لیکن قتال یا مقاتلہ (باب مفاعلہ میں) کا مفہوم یہ ہو گا کہ دو فریق ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہیں، یا ایک فوج دوسری فوج کے مقابلے میں ہے۔ جہد اور قتل کے الفاظ تو اردو زبان میں عام مستعمل ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔

''جہاد'' بطور اصطلاح

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاد کی اصطلاح کس مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاد کا لفظ سب سے پہلے مکی سورتوں میں آیا ہے، لیکن وہاں ''جہاد فی اللہ'' کے الفاظ آئے ہیں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے نہیں۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں فرمایا ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ ''جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے''۔ اسی طرح سورۃ العنکبوت کی آخری آیت ملاحظہ فرمائیں، ارشاد ہوا ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''جو لوگ ہمارے لیے جہاد کریں گے (محنت، کوشش، جدوجہد کریں گے) ہم ان کے لیے اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے (اور ان کے لیے رہنمائی دیتے چلے جائیں گے)''۔

اس سے آگے بڑھ کر پھر مدنی سورتوں میں اس کے ساتھ لفظ ''سبیل'' کا اضافہ ہو گیا اور جہاد فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں جہاد) ایک اصطلاح بن گئی۔ اسی طرح ''قتال فی سبیل اللہ'' بھی ایک اصطلاح بن گئی۔

انسان جو جدوجہد اور محنت کرتا ہے اس میں وہ دو چیزیں کھپاتا ہے، یعنی مال اور جان۔ لہٰذا جہاد کے ساتھ ''بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ'' کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی آپ کے

پاس جو بھی وسائل و ذرائع ہیں، جو بھی اللہ نے آپ کو دولت دی ہے اس کو اس مقصد کے لیے خرچ کیجیے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت، سمجھ، شعور اور ذہانت دی ہے اس کو بھی اللہ کی راہ میں لگائیے۔

جہاد فی سبیل اللہ ''بِالْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ'' کے علاوہ ''بِ'' کے تعدیہ کے ساتھ قرآن مجید میں تو صرف ایک اصطلاح مزید آئی ہے وہ ہے ''جہاد بالقرآن'' یعنی قرآن کے ذریعے سے جہاد۔ جہاد کیلئے ہتھیار کیا ہوگا؟ کس چیز سے جہاد کریں گے؟ قرآن کے ذریعے سے! ''جہاد بالقرآن'' کی اصطلاح سورۃ الفرقان میں وارد ہوئی ہے، جس کا آغاز ہی ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ یعنی ''نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کیلئے خبردار کر دینے والا ہو''۔ اس سورۃ کے تانے بانے میں قرآن مجید سے متعلق مضامین بنے ہوئے ہیں۔ اسی میں فرمایا گیا ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ''پس (اے نبیؐ!) آپ ان کافروں کی بات ہرگز نہ مانئے اور اس قرآن کے ذریعے سے ان کے خلاف پورے زور وشور سے جہاد جاری رکھئے!''☆

اس ضمن میں حدیث میں تین اصطلاحات مزید آئی ہیں (۱) جہاد بالقلب: کسی شے سے شدید قلبی نفرت، یہ بھی درحقیقت ایک جہاد ہے۔ (۲) جہاد باللسان: کسی برائی کے خلاف زبان کھولنا۔ یہ اس کا اگلا درجہ ہے۔ (۳) جہاد بالید: ہاتھ سے یعنی طاقت اور قوت سے برائی کے خلاف کوشش کرنا۔ یہ گویا سب سے اونچا درجہ ہے۔ یہ درجات صحیح مسلم کی دو احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ پہلی حدیث حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ رَاٰى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (۴)

☆ ''جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ'' کے نام سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا ایک کتابچہ بھی موجود ہے جو اپنے اختصار کے باوجود آنجناب کے رسوخ فی العلم پر شاہد ہے، اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

''تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ (کی قوت) سے اس کو بدل ڈالے، پھر اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس کے خلاف آواز اٹھائے)، لیکن اگر وہ اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اس برائی سے نفرت رکھے)، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

اس مضمون کو لفظ جہاد کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے اللہ نے کسی نبی کو اس کی اُمت کی طرف مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے کچھ نہ کچھ صحابی اور حواری ہوتے تھے جو اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے، لیکن بعد میں ایسے ناخلف لوگ آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔

((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(۵)

''پس جو کوئی ایسے لوگوں کے خلاف اپنے ہاتھ (طاقت) سے جہاد کرے گا وہ مؤمن ہوگا، اور جو ان کے خلاف اپنی زبان سے جہاد کرے گا وہ مؤمن ہوگا، اور جو ان کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا (ان کے کرتوتوں سے شدید نفرت رکھے گا) وہ مؤمن ہوگا، اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں''۔

واضح رہے کہ عام طور پر قتال کے لیے ''جہاد بالسیف'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ''ب'' کے اضافے کے ساتھ یہ پانچ اصطلاحیں ہمارے سامنے آ گئیں:

① جہاد بالقرآن، ② جہاد بالقلب، ③ جہاد باللسان، ④ جہاد بالید، ⑤ جہاد بالسیف

جہاد کی منزلیں

''جہاد فی سبیل......'' کی تین منزلیں ہیں:

① جہاد فی سبیل الحیاۃ

جہاد فی سبیل...... کی پہلی منزل جہاد فی سبیل الحیاۃ ہے۔ یعنی زندہ رہنے کے لیے جہاد۔ اسے علامہ اقبال نے ''جہادِ زندگانی'' سے تعبیر کیا ہے۔

یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں!

نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے ایک اصطلاح Struggle for Existance اسی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ زندہ رہنے اوراپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ہر کسی کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اس میں اپنے ابنائے نوع سے مسابقت (Competition) کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔مثال کے طور پر اگر کہیں ملازمت کی ایک جگہ نکلتی ہے تو اس کے لیے سینکڑوں درخواستیں آتی ہیں اور ہر درخواست کنندہ اپنا سازور لگا رہا ہوتا ہے، سفارش کروائی جاتی ہے اور بھاگ دوڑ کی جاتی ہے۔ یہ سب اس لیے کہ معاش کی ایک شکل پیدا ہو جائے۔''جہاد فی سبیل الحیاۃ'' گویا کہ ہر ذی حیات (Living Organism) کا لازمہ ہے۔ ہر شے جو زندہ ہے اس کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جہاد کرنا پڑتا ہے۔اسی تصور میں ''بقائے اصلح''(Survival of the fittest) کا تصور شامل کیا جاتا ہے۔

زندگی کا یہی جہاد اگر بندۂ مؤمن کرتا ہے تو یہ اس کے لیے عبادت کے درجے میں ہو گا، بشرطیکہ وہ احکامِ الٰہی کی پابندی کرتا ہو۔ اگر وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی معاش کما رہا ہے تو اس کے لیے ''اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ'' کی بشارت ہے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن حلال اور حرام کی حدود کو قائم رکھتے ہوئے، حلال پر اکتفا کرتے ہوئے اور حرام سے قطعی طور پر بچتے ہوئے ''جہاد فی سبیل الحیاۃ'' کر رہا ہے تو یہ اس کے لیے عبادت کے درجے میں ہے۔ تاہم اس کے لیے ایک اور خاص قسم کے جہاد کی ضرورت ہوگی، جو بعد میں بیان کیا جائے گا۔

② جہاد فی سبیل الحقوق

''جہاد فی سبیل الحیاۃ'' سے بلند تر منزل ''جہاد فی سبیل الحقوق'' کی ہے۔اپنے حقوق کی جدوجہد میں سب سے بڑا جہاد ''جہاد فی سبیل الحریۃ'' ہے۔آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور آزادی کے حصول کے لیے جہاد مسلمان اور غیر مسلم سب کرتے رہے ہیں۔ تیسری دنیا نے نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کی تو محنت، جدوجہد اور جہاد کے

نتیجے میں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سب لوگوں نے آزادی کی راہ میں جان دینے والوں کے لیے ''شہید'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہندو بھی شہید کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ جن مجاہدین آزادی نے آزادی کے حصول کے لیے اپنی جانیں قربان کیں وہ ان کے شہداء ہیں۔ بنگلہ دیش میں جن لوگوں نے پاکستان سے علیحدگی کے لیے جانیں دیں ان کے لیے بھی شہدائے بنگلہ دیش کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

جہاد فی سبیل الحریۃ کو مَیں نے جہاد فی سبیل الحقوق سے خاص کیا ہے۔ اس لیے کہ شیر کے مُنہ میں سے نوالا نکالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جن طبقات نے لوگوں کے حقوق غصب کیے ہوئے ہیں ان کے چنگل سے نکلنا آسان کام نہیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں۔ اسی طرح اگر کسی قوم نے دوسری قوم کو غلام بنالیا ہے تو اس سے آزادی حاصل کرنا آسان کام نہیں، لہٰذا اس کے لیے جہاد ہوسکتا ہے، بلکہ قتال کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ یہ جہاد اگر کوئی مسلمان شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے کرتا ہے تو یہ جائز ہے، اور اگر اس میں اپنی جان دیتا ہے تو وہ مرتبہ شہادت پر فائز ہوتا ہے، اگرچہ درجے کے اعتبار سے یہ شہادت وہ نہیں جو جہاد فی سبیل اللہ میں جان دینے سے ہوتی ہے۔ ع ''گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی!'' شہادت کے درجات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا، لیکن بہرحال یہ مرتبہ شہادت ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ))(٦) ''جو کوئی اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا تو وہ شہید ہے''۔ یعنی کسی مؤمن پر اگر ڈاکوؤں نے حملہ کیا ہے تو اس کے سامنے دو راستے ہیں، یا تو وہ کہے کہ میری جان بخشی کرو اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے لو، اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے مال کی حفاظت میں ڈٹ جائے اور مقابلہ کرے۔ اس صورت میں اگر وہ مارا گیا تو اس کا درجہ شہید کا ہے۔

③ نظریہ اور نظام کی سطح پر جہاد

اگر آپ کسی خاص نظریئے کے قائل ہوگئے ہوں، اس کی حقانیت آپ کے دل میں جاگزیں ہوگئی ہو اور اب آپ چاہتے ہوں کہ اس نظریئے کا پرچار ہو، اس نظریہ پر مبنی نظام

قائم ہو اور اس کے منافی نظام کو ختم کیا جائے اور اس پورے نظام کی دھجیاں بکھیر دی جائیں (علامہ اقبال کے الفاظ میں ''برہم زن'' اور شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں **فُكَّ كُلِّ نَظَامٍ**) تو یہ جہاد کی بلند ترین منزل ہے۔ اس کا تعلق انسان کے خیالات، نظریات، عقائد اور سوچ و فکر سے ہے۔ ظاہر بات ہے پھر اس نظریئے پر مبنی جہاد ہوگا۔ اپنے پسندیدہ نظریئے کو پھیلانا، عام کرنا اور اس نظریئے پر مبنی نظام قائم کرنے کے لیے جہاد نظریاتی جہاد ہوگا۔ فرض کیجیے اگر کسی کے ذہن میں اشتراکیت کا فلسفہ بیٹھ گیا ہے اور وہ اسی کو صحیح سمجھتا ہے، تاریخ کی یہی تعبیر اسے درست معلوم ہوتی ہے تو اب اگر اس نے اس نظریئے کو پھیلایا اور اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی تو یہ ''جہاد فی سبیل الاشتراکیة'' ہے۔ عوام کے جمہوری حقوق کے لیے آواز اٹھانا، جاگیرداری نظام سے آزادی حاصل کر کے جمہوریت کے قیام کی جدوجہد کرنا ''جہاد فی سبیل الدیموکراتیة'' ہے۔

اسی طرح ایک جہاد ''فی سبیل الشرک'' ہے، یعنی شرک کے حق میں جہاد کرنا۔ اس معنی میں یہ لفظ (جہاد) قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے کہ مشرک والدین اگر تم سے جہاد کریں کہ تم اللہ کے ساتھ شرک کرو تو ان کی اطاعت مت کرنا۔ سورۃ العنکبوت میں الفاظ آئے ہیں ﴿**وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَـيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا**﴾ اور سورۂ لقمان میں فرمایا ﴿**وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَـيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا**﴾ مشرک والدین کے نوجوان بیٹے جب ایمان لے آئے تو ان پر مشرک والدین کا بھرپور دباؤ یہ تھا کہ واپس آجاؤ اور اس دین کو چھوڑ دو۔ ان کا دباؤ اور کوشش درحقیقت جہاد فی سبیل الشرک، فی سبیل الکفر اور فی سبیل الطاغوت تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ آیت بھی آئی ہے ﴿**اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ الطَّاغُوۡتِ**......﴾ (النساء:٧٦) ''جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں......'' ظاہر بات ہے بدر میں ابوجہل اور اس کے ساتھی بھی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر آئے تھے، لہٰذا وہ بھی مجاہد تھے، لیکن وہ مجاہد فی سبیل الشیطان، فی سبیل الشرک اور فی سبیل الطاغوت تھے۔ جبکہ ﴿**مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ**﴾ مجاہدین فی سبیل اللہ تھے۔

یہاں آ کر اب ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح معین ہوئی۔ ''جہاد'' کی تیسری منزل کسی نظریئے اور نظام کی بنیاد پر جہاد ہے اور اسلام میں وہ نظریہ ایمان ہے۔ ایمان کے اس نظریئے پر ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی منازل

جہاد فی سبیل اللہ کی تین منزلیں ہیں:

① پہلی منزل کے تین جہاد

(i) جہاد مع النفس: پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر کوئی بندۂ مؤمن جہاد فی سبیل الحیاۃ، یعنی زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے تو اگر وہ یہ جدوجہد حلال وحرام کی حدود کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، یعنی حرام سے بالکل اجتناب کرتے ہوئے اور صرف حلال پر اکتفا کرتے ہوئے کر رہا ہے تو وہ اس کے لیے عبادت کے درجے میں ہے۔ اپنے آپ کو احکامِ شریعت کا پابند بنانے کے لیے بھی جہاد کی ضرورت ہے اور یہ جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل ہے۔ خود مسلمان ہونے کے لیے، خود اللہ کی اطاعت پر کاربند رہنے کے لیے، شریعت کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے، اپنے وجود پر اللہ کا حکم قائم کرنے کے لیے، خود اپنی ذات پر خلافت کا نظام قائم کرنے کے لیے جہاد کرنا جہاد فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل ہے۔

واضح رہے کہ اوّلین ہونے کے ناطے یہ اہم ترین بھی ہے۔ اس لیے کہ اس پہلی منزل پر دوسری منزل تعمیر ہوگی، جو بلند تر ہوگی، اس کے اوپر تیسری منزل اس سے بھی بلند تر ہوگی۔ لیکن اہم ترین پہلی منزل ہے، کیونکہ پہلی منزل وجود میں آئے گی تو اس پر دوسری منزل بنے گی اور دوسری منزل موجود ہوگی تو تیسری بنے گی۔ اوپر کی دو منزلوں کی پختگی اور مضبوطی کا دار ومدار بالکلیہ پہلی منزل پر ہے۔ اس حوالے سے جہاد فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ شریعت کے اوامر ونواہی کا پابند ہونے کے لیے جہاد کیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد ضروری ہے۔

ایمان کا نور قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا

مِصۡبَاحٌ﴾ (النور:۳۵) ''اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو''۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک یہاں ''فِیۡ قَلۡبِ الۡمُؤۡمِنِ'' کے الفاظ محذوف ہیں۔یعنی ''مَثَلُ نُوۡرِہٖ فِیۡ قَلۡبِ الۡمُؤۡمِنِ''۔مؤمن کے دل میں جونورِ ایمان آتا ہے وہ دو اجزاء نورِ فطرت اور نورِ وحی پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں فرمایا ﴿نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ﴾

اب انسان میں حیوانی تقاضے (Animal Instincts) بھی موجود ہیں جو بہت زوردار ہیں۔ظاہر بات ہے کہ زندہ رہنے کا تقاضا بہت شدید ہے، زندہ رہنے کے لیے اسے کھانے پینے کو بھی چاہیے،اسے رزق اور تسکین چاہیے۔ پھر صرف یہ نہیں کہ وہ ضرورت کی حدتک ہو، بلکہ اس میں کچھ لذات بھی ہوں، اللہ نے taste Buds پیدا کیے ہوئے ہیں۔ پھر یہ کہ اپنی نسل کی بقاء کے لیےاس کے اندر ایک جنسی جذبہ موجود ہے۔فرائڈ کے نزدیک تو یہ انسان کے اندر سب سے قوی جذبہ ہےاور انسانی محرکاتِ عمل میں یہ جذبہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔انسان کے خاکی وجود میں جوحیوانی داعیات موجود ہیں وہ تو اپنی تسکین چاہتے ہیں، انہیں حلال وحرام سے کوئی غرض نہیں۔ چنانچہ پیٹ بھرا ہونا چاہیے، زبان کو چٹخارہ چاہیے، جنسی جذبہ بھی اپنی تسکین چاہتا ہے۔ یہ تمام instincts اندھے بہرے ہیں، انہیں جائز وناجائز اور حلال وحرام سے کوئی بحث نہیں۔ یہ گویا کہ انسان پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں۔سورۂ یوسف کی آیت ۵۳ میں اس کی تعبیریوں کی گئی ہے ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ ''نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔یعنی ہمارے اندر کاحیوان جوتمام حیوانی تقاضے رکھتاہے،انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔گویا۔

''ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!''

کے مصداق انسان کواس کی روح نیکی کی طرف کھینچ رہی ہے اور دوسری طرف اس کا نفس اسے برائی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ چنانچہ ہمارے اندرونی میدانِ جنگ میں کشاکش خیروشر برپا ہے، جس کے دوفریق ہیں جوایک دوسرے کے خلاف زور آزمائی کررہے ہیں۔ نفس

انسانی کے لیے مولانا روم نے اس شعر میں بہترین تعبیر کی ہے ؎

نفس ماھم کم تر از فرعون نیست

لیک او را عون و ما راعون نیست!

یعنی یہ میرا نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ اس لیے کہ جیسے فرعون نے کہا تھا کہ ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ﴾ (الزخرف:۵۱) ''کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور یہ سارا آبپاشی کا نظام میرے کنٹرول میں نہیں ہے؟'' مَیں جس کا پانی چاہوں جاری رکھوں اور جس کا چاہوں بند کر دوں، یہ میرے اختیار میں ہے۔ اس طرح یہ نفس کہتا ہے کہ یہ وجود میرا ہے، اس پر میرا حکم چلے گا، مجھے اس سے غرض نہیں خدا کون ہے، اس کا کیا حکم ہے۔ اسی طرح یہ نفس کہتا ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، میری خواہشات، میرے جذبات اور میری شہوات کی تسکین ہونی چاہیے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فرعون کے پاس لاؤ لشکر بھی تھا، مدد (فوج) تھی، لہٰذا اس نے زبان سے بھی کہہ دیا ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کہ میں ہی تمہارا بڑا رب ہوں۔ لیکن میرے نفس کے پاس چونکہ کوئی فوج نہیں ہے، اس کے کوئی اعوان وانصار نہیں ہیں، لہٰذا یہ زبان سے خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا۔

اب یہاں ایک حدیث شریف ملاحظہ کیجیے جس میں نفس کے خلاف جہاد کو ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى)) (۷) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔

یہاں دو الفاظ ''افضل'' اور ''اعلیٰ'' کا فرق نوٹ کر لیجیے۔ ''اعلیٰ'' یعنی بلندترین تیسری منزل ہے، لیکن افضل پہلی منزل ہے، اس اعتبار سے کہ یہ مضبوط اور مستحکم ہو گی تو اس پر اگلی منزل کی تعمیر کا سوال پیدا ہو گا۔ اگر یہی کمزور ہے اور اوپر آپ نے مزید بوجھ ڈال دیا تو پوری عمارت ہی بیٹھ جائے گی۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''افضل'' اور ''اعجب'' کا

فرق کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ افضل ایمان تو بلا شک وشبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے، یہاں تک کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا ''کیا تم جانتے ہو کہ ''اعجب الایمان'' کون ہے؟'' یعنی سب سے زیادہ خوبصورت، عجیب اور دل کو لبھانے والا ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے جواب میں عرض کیا کہ فرشتوں کا ایمان، جو کہ اللہ کے حضور میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((وَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) ''وہ کیسے ایمان نہ لائیں جبکہ وہ تو اپنے ربّ کے پاس ہی ہیں؟'' ایمان میں ان کا اپنا کون سا کمال ہوا؟ دوسری مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا: رسولوں کا ایمان! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((وَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) ''وہ کیسے ایمان نہ لاتے، ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے''۔ پھر صحابہ کرامؓ نے بڑی جرأت کر کے عرض کیا ''فَنَحْنُ'' پھر ہمارا ایمان اَعجب ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ((وَمَالَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) ''تم کیسے ایمان نہ لاتے جبکہ میں تمہارے مابین بنفس نفیس موجود ہوں''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا)) (۸)

''میرے نزدیک مخلوق میں خوبصورت ترین (اور دل کو لبھانے والا) ایمان تو ان لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد آئیں گے (ان کو میری صحبت سے حصہ نہیں ملے گا)، انہیں (اللہ کی) کتاب کے اوراق ملیں گے تو وہ ان میں موجود حقائق پر ایمان لائیں گے''۔

چنانچہ اَعجب ایمان تو بعد والوں کا ہے جبکہ افضل ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اس طرح اعلیٰ جہاد، جہاد کی آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے، لیکن افضل جہاد، جہاد مع النفس ہے۔

(ii) <u>شیطانِ لعین اور اس کے غیر مرئی لشکر کے خلاف جہاد</u>: شیطان ہمارے نفسانی تقاضوں میں پھونکیں مارتا اور انہیں مشتعل کرتا ہے۔ شیطان ہمیں ورغلاتا ہے برے راستے کو مزین کر کے دکھاتا ہے، اس لیے کہ شیطان ہمارا دشمن ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:٦) ''درحقیقت شیطان ہمارا دشمن

ہے، لہٰذا تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو''۔ سورۂ کہف میں شکوے کے انداز میں فرمایا ﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا﴾ ''کیا تم مجھے چھوڑ کر ابلیس اور اس کی ذریت (اس کے ایجنٹ اور چیلے چانٹوں) کو اپنا دوست (اور سرپرست) بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بہت ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں''۔ میری دوستی اور میری ولایت کو چھوڑ کر انہوں نے شیطانِ لعین کے ساتھ دوستی گانٹھ لی ہے؟ شیطان کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے: ﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ (الاعراف:۲۷) ''شیطان اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے تاکتے ہیں (اور وہاں سے حملہ آور ہوتے ہیں) جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے''۔ایک غیر مرئی شیطان (جن) تو ہر انسان کے ساتھ لگا دیا گیا ہے جو اسے برائی پر اکساتا رہتا ہے۔

ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں ((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ)) [(۹)] (متفق علیہ) یعنی ''شیطان تو انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون گردش کرتا ہے''۔اب اس کی دو توجیہات ممکن ہیں۔ایک تو یہ کہ یہ شیاطین چونکہ جِنّات ہیں اور ان کا مادۂ تخلیق نار ہے اور نار ایک لطیف شے ہے، لہٰذا اس کی لطافت کی وجہ سے وہ واقعتاً انسان میں سرایت ہی کر جاتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے نفس کو مشتعل کر دیتے ہوں، اور چونکہ نفس ہمارے پورے انسانی وجود کو کنٹرول کر رہا ہے، تو اس طرح گویا وہ بالواسطہ ہمارے پورے وجود میں سرایت کر جاتے ہوں۔ واللہ اعلم

<u>(iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد</u>: اگر کوئی معاشرہ بگڑ گیا ہے اور اس کے رجحانات غلط ہو گئے ہیں تو اس کا ایک دباؤ ہوتا ہے جو انسان کو غلط رُخ کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ہر شخص کو ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہوگا کہ کوئی ہجوم ایک رُخ پر جا رہا ہو تو اُس رُخ پر چلنا بہت آسان ہو جاتا ہے، لیکن اس کے خلاف چلنے کے لیے بڑی مشقت و محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بڑا زور لگا کر آپ دو چار قدم آگے بڑھائیں لیکن اس ہجوم کا ایک ریلا آئے اور وہ آپ کو دھکیل کر پھر دس قدم پیچھے لے جائے۔ لہٰذا اگر

معاشرے کا رُخ بے حیائی کی طرف ہے، معاشرہ اللہ کی بغاوت کی طرف چل رہا ہے اور سب لوگ اس حال میں خوش وخرم، مسرور اور مگن ہیں اور وہ اس رخ پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں، تو ان میں سے کسی ایک شخص کا اللہ کی طرف رخ کر کے بڑھنا اور "اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا" کا اعلان کرنا آسان کام نہیں ہے۔

ایسے شخص کو اس معاشرے کے خلاف شدید جدوجہد کرنی پڑے گی، اور ہو سکتا ہے کہ اسے سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے خلاف ہی جہاد کرنا پڑے۔ سورۃ التغابن میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ﴾

"اے اہل ایمان! تمہاری اپنی بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن موجود ہیں، لہٰذا ان سے بچ کر رہو"۔

اور پھر یہ کہ مال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ سارا معاملہ گھر سے شروع ہو جائے گا۔ پھر رشتہ داری اور برادری کا معاملہ ہے۔ آپ نے اس معاشرے میں رہنا ہے اور اس کے اپنے غیر اسلامی رسوم ورواج ہیں۔ تو اب برادری اور قبیلے سے کیسے کٹ جائیں؟ اس کا دباؤ ہے۔ اب آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ آسان راستہ تو یہ ہے کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!" یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کر رہا ہے تو تم زمانے کے ساتھ موافق ہو جاؤ اور اسی رنگ میں ڈھل جاؤ۔ اس طرح کھینچا تانی (friction) ختم ہو جائے گی۔ اختلاف اور مزاحمت تو اسی وقت ہوتی ہے کہ لوگ اُدھر جا رہے ہوں اور تم اِدھر آ رہے ہو، لیکن اگر تم نے بھی وہی رخ اختیار کر لیا تو سیدھا اور آسان راستہ ہے۔ لیکن جس چیز کو جہاد کہا جائے گا وہ یہ ہے کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!" یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کر رہا ہے تو تم زمانے سے جنگ کرو، اس کے خلاف لڑو، جہاد کرو۔

یہ تھی جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل، جس کے تین مراتب یا مدارج (sub stages) میں نے آپ کو بتائے ہیں۔

۲ باطل نظریات کے خلاف جہاد

جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل باطل عقائد ونظریات کے خلاف جہاد ہے۔ انسان

ایک متمدن حیوان ہے اور ایک معاشرے میں رہتا ہے۔ جب ایک شخص کو اللہ و آخرت پر پختہ یقین حاصل ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو شریعت کے احکام پر کاربند کر لیا تو یہاں سے بات بالکل فطری طور پر باہر نکلے گی۔ اس لیے کہ اگر آپ نے اندر کے جہاد کا مرحلہ طے کر لیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ آپ کی شخصیت سے یہ جہاد خارج میں نہ نکلے۔ اگر یہ باہر نہیں نکل رہا تو اس کا مطلب ہے کہ اندر کہیں فساد ہے۔ اگر آپ کو آگ نظر آ رہی ہے لیکن اس کے پاس بیٹھنے سے آپ کو تپش محسوس نہیں ہو رہی تو یقیناً وہ آگ نہیں، صرف آگ کی شکل ہے۔ جیسے آج کل ایسے الیکٹرک ہیٹرز ہوتے ہیں کہ ان میں دہکتے ہوئے انگارے نظر آتے ہیں لیکن وہ انگارے نہیں ہوتے، حرارت تو کہیں اور سے آ رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی شخصیت کے اندر سے اثرات کا اپنے ماحول میں سرایت کرنا یقینی ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس چار شواہد ہیں:

(۱) یہ قانونِ طبعی کے تحت لازم ہے۔ آگ کی بھٹی میں سے حرارت کا برآمد ہونا ایک طبعی امر ہے۔ لہٰذا اگر آپ کے اندر ایمانی حرارت کی بھٹی دہک گئی ہے تو اس حرارتِ ایمانی کے اثرات آپ کی شخصیت سے لازماً باہر نکلیں گے۔

(۲) یہ انسان کی مروّت اور شرافت کا تقاضا ہے جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱۰)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایمان کی جو نعمتِ عظمیٰ تمہیں عطا فرمائی ہے اسے اپنے بھائی بند، اعزہ و اقارب، اپنی قوم، قبیلہ، برادری اور پھر پوری نوعِ انسانی میں بانٹو اور اسے لوگوں کے ساتھ share کرو، کیونکہ یہ آپ کی شرافت اور مروّت کا تقاضا ہے۔

(۳) یہ آپ کی غیرت کا بھی تقاضا ہے کہ جس شے کو آپ نے حق سمجھا ہے اگر اس کے خلاف باطل کا غلبہ ہے تو آپ اس کے خلاف جہاد کریں اور اس کے لیے دعوت کا آغاز کریں۔ دعوت و تبلیغ نظریاتی سطح پر جہاد کا پہلا مرحلہ ہے۔ یہاں وہ لرزا دینے والی حدیث

ملاحظہ کر لیجیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَائِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا، قَالَ فَقَالَ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِكَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ، قَالَ فَقَالَ اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ ، فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ)) (١١)

''اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ فلاں فلاں شہروں کو اُن کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو۔ اس پر جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔ (جبرئیل علیہ السلام کے ان الفاظ سے اُس شخص کے تقویٰ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور یہ بھی نوٹ کیجیے کہ اس کے تقویٰ کی گواہی دینے والا کوئی کرائے کا وکیل نہیں ہے، بلکہ جبرائیل ہیں، اور وہ اُس بارگاہ میں گواہی دے رہے ہیں جہاں ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔) اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ الٹو اس بستی کو پہلے اُس پر اور پھر دوسروں پر، اس لیے کہ اس کا چہرہ میری غیرت وحمیت میں کبھی متغیر نہیں ہوا''۔

آپ غور کیجیے کہ اگر کوئی آپ کو ماں کی گالی دے تو اس پر آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟ اگر آپ کے جسم میں جان ہے تو کیا آپ اسے یونہی جانے دیں گے؟ ہرگز نہیں! فرض کیجیے آپ کمزور ہیں تو بھی کم سے کم آپ کے پورے جسم کا خون آپ کے چہرے پر سمٹ آئے گا اور آپ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھے گا۔ لیکن اگر اللہ کے احکام ٹوٹ رہے ہوں، ان کی دھجیاں بکھر رہی ہوں، باطل کا ڈنکا بج رہا ہو، طاغوت کا بول بالا ہو اور بندۂ مؤمن فقط ''اللہ اللہ'' کرنے میں لگا ہوا ہو تو اس سے بڑھ کر اور کوئی مجرم نہیں۔ یہی تو ابلیس چاہتا ہے کہ ؏

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اس عابد وزاہد شخص پر اللہ تعالیٰ کا غضب خاص طور پر اس لیے نازل ہوا کہ دوسرے لوگ تو غافل تھے، انہیں اللہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان کا اللہ سے کوئی تعارف اور حق ان پر منکشف نہیں ہوا تھا۔ یہ عبادت گزار، طاعت گزار، عابد وزاہد شخص اور اس نے اللہ کے معاملے میں اس قدر بے حسی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ کبھی اللہ کی غیرت میں

متغیر نہیں ہوا! آپ اگر اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کے لیے آپ کے اندر غیرت ہونی چاہیے۔ آپ دین کو مانتے ہیں تو آپ کے اندر دینی حمیت ہونی چاہیے۔

دعوت و تبلیغ : باطل عقائد و نظریات کے خلاف جہاد کے لیے دین کی بہت سی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً ''دعوت و تبلیغ'' ایک اصطلاح ہے۔ ان دونوں الفاظ میں بڑا پیارا رشتہ ہے۔ تبلیغ میں آپ کسی کے پاس اپنی بات پہنچانے کے لیے جاتے ہیں اور دعوت میں آپ اُسے کھینچ کر اپنی بات کی طرف لاتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' اور ''وعظ و نصیحت'' جیسی اصطلاحات بھی مستعمل ہیں۔ اور اس ضمن میں جامع ترین اصطلاح ''شہادت علی الناس'' ہے، یعنی دعوت کا حق اس حد تک ادا کر دینا کہ قیامت کے دن کھڑے ہو کر یہ گواہی دے سکو کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ یہ اصلاً انبیاء و رسل کی ذمہ داری تھی، جو ختم نبوت کے نتیجے میں اس اُمت مسلمہ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں فرمایا:

﴿اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ (الحج:۷۵)

''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی''۔

رسول، اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کے پاس اللہ کا پیغام فرشتوں کے ذریعے آتا تھا جو وہ لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔ جب لوگ اس پیغام کو فراموش کر دیتے تو اس کی یاددہانی کے لیے ایک اور رسول آ جاتا۔ فرشتہ اور رسول دونوں ہی اللہ کے فرستادہ اور پیغامبر ہوتے تھے، ایک رسولِ ملک ہوتا اور ایک رسولِ بشر۔ یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ تک چلتا رہا، جو اللہ کے آخری رسول ہیں۔ رسولِ ملک جبرائیل علیہ السلام ہیں اور رسولِ بشر محمد ﷺ۔ جبرائیل علیہ السلام نے اللہ سے پیغام لے کر محمد ﷺ تک پہنچایا اور محمد ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے لے کر اُمت تک پہنچایا۔ اب امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے پوری نوعِ انسانی کو پہنچائے۔ اس لیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ آخری رسول ہیں اور وہ تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا......﴾ (سبا:۲۸)

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر''۔

یہ آیت تو بعد میں نازل ہوئی تھی، حضور ﷺ نے تو یہ بات اپنے بالکل ابتدائی خطبے میں ارشاد فرما دی تھی۔ جب آپؐ نے بنو ہاشم کو دعوت دے کر جمع کیا اور کھانا کھلایا تو اس موقع پر آپ ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ الفاظ موجود ہیں:

((وَاللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ، اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَـیْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَی النَّاسِ كَافَّـةً)) (نهج البلاغة)[۱۲]

''اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم''۔

اب ظاہر بات ہے کہ دعوت و تبلیغ کا یہ حق کون ادا کرے گا؟ اُمت کے خلاف شہادت تو رسول اللہ ﷺ دیں گے کہ اے اللہ! تیرا جو پیغام آیا تھا وہ میں نے ان کو پہنچا دیا تھا۔ اسی لیے حجۃ الوداع میں آپؐ نے ایک لاکھ سے زائد مجمع سے یہ گواہی لے لی ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) ''لوگو! میں نے (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا یا نہیں؟'' جواب میں صحابہ کرامؓ نے فرمایا:

''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّـكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ''

(ہاں! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا ہے، امانت کا حق ادا کر دیا ہے اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔)

یہ گواہی تین دفعہ دہرائی گئی۔ اس کے بعد آنحضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!)) اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! پھر آپؐ نے فرمایا ((فَلْيُبَـلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))[۱۳] یعنی ''اب یہ ان کی ذمہ داری ہے جو یہاں موجود ہیں کہ پہنچائیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہے''۔ اس میں وہ تمام انسان شامل ہو گئے جو اُس وقت موجود تھے اور جو موجود نہیں تھے اور جو قیامت تک دنیا میں آئیں گے۔ یہی وہ شہادت علی الناس کی ذمہ داری ہے جس کے لیے اس اُمت کی تشکیل ہوئی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی مذکورہ بالا آیت آپ نے ملاحظہ کی جس میں فرمایا گیا:

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾

''اللہ پسند کر لیتا اپنے فرشتوں میں سے بھی پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی''۔

اور آخری آیت میں فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ......﴾ (الحج:۷۸)

''اور جہاد کرو اللہ کی خاطر جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔اس نے تمہیں (اپنے کام کے لیے بحیثیت اُمت) چن لیا ہے''۔

پہلے رسالت کی دو کڑیاں تھیں، رسولِ ملک اور رسولِ بشر، اور اب رسالت کی تیسری کڑی یہ اُمت ہے، جس کے ذمے پوری نوع انسانی تک شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنا ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے آخر میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾

''تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو''۔

سورۃ البقرۃ میں اس مضمون کو کھول کر بیان فرمایا گیا کہ اس اُمت کی تأسیس کی غرض وغایت ہی یہ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرة:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائے''۔

ظاہر بات ہے یہ کام محنت ومشقت چاہتا ہے، اس کے لیے جان، مال اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ دعوت کو انسانوں تک پہنچا دینا آسان کام نہیں ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی اس دوسری منزل کے مزید تین درجات ہیں، جو سورۃ النحل میں بیان ہوئے ہیں۔فرمایا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۲۵﴾ (النحل)

''(اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف دعوت دیجیے حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کیجیے ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ آپ کا ربّ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے''۔

اس آیت میں سوسائٹی کے اندر موجود تین طبقات کی نشاندہی کی گئی ہے، اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے ان طبقات کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ع ''لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!'' کے مصداق لوگوں نے دعوت وتبلیغ کو بہت آسان کام سمجھ رکھا ہے۔ گویا کہ دعوت وتبلیغ بہت آسان کام ہے کہ تقریر کی، قصے کہانیاں بیان کیے اور کہہ دیا ''وما علینا الا البلاغ''۔ گویا کہ ہم نے ابلاغ کی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔ قرآن حکیم دعوت وتبلیغ کے تین درجے بیان کرتا ہے:

① ازروئے قرآن ابلاغ وتبلیغ کے تقاضوں میں سرفہرست دعوت "بالحکمة" ہے، یعنی حکمت اور دانائی کے ساتھ دعوت۔ اس حکمت ودانائی کو عام لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر حکمت عملی سمجھا ہے، یعنی آدمی کو دیکھو، اس کی نفسیات وغیرہ مدّنظر رکھو۔ اس بات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، اس کی نفی نہیں، لیکن یہاں ''بالحکمة'' ان معنوں میں نہیں آیا، بلکہ ''الموعظة الحسنة'' کے مقابلے میں آ رہا ہے، یعنی دلیل، برہان argument کے ساتھ دعوت دی جائے۔ قرآن اپنے مخالفین سے دلیل مانگتا ہے ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو''۔ مخالفین کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کے مبلغین سے دلیل اور برہان طلب کریں اور اپنے اعتراضات کے جواب مانگیں۔

اس حوالے سے نوٹ کر لیجیے کہ انسانی معاشرے میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جسے معاشرے کے دماغ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کہ انسان کے جسم میں موجود دماغ (جو بمشکل نصف سیر کا ہوگا) دو من وزنی جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور پورا جسم اس کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ ہاتھ کسی شے کو پکڑیں یا نہ پکڑیں اس کا فیصلہ یہاں ہوتا ہے۔ سامنے لکڑی ہے یا سانپ، اسے پکڑنا ہے یا نہیں پکڑنا، اس کی معلومات یہاں سے دی جاتی ہیں۔ ہاتھ

لکڑی کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھ گیا تھا لیکن اسے فوراً روک لیا گیا کہ یہ تو سانپ ہے۔ یہ سب کنٹرول دماغ سے ہو رہا ہے۔ پاؤں ہمیں لے کر کدھر جائیں کدھر نہ جائیں، اس کا فیصلہ یہاں ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ بھی بالکل اسی طرح ایک زندہ وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک طبقہ اس کا Brain Trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ Intelligentsia یا Intellectual Elite پر مشتمل ہوتا ہے، جو سوچنے سمجھنے والوں کا طبقہ ہوتا ہے۔ وہ طے کرتے ہیں کہ معاشرے میں کس چیز کا فروغ ہونا ہے اور کس چیز کو روک دیا جانا ہے، کدھر بڑھنا ہے اور کدھر سے پیچھے ہٹ جانا ہے۔ جبکہ پوری قوم کا معاملہ ہاتھ اور پاؤں کی طرح ہوتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے ہر انقلابی عمل میں سب سے پہلے انقلابی نظریہ کو معاشرے کا ذہین طبقہ قبول کرتا ہے، اور پھر وہ اس بات کو نیچے تک پہنچاتا ہے۔ اس طبقہ کے لیے، ظاہر بات ہے، وعظ و نصیحت مؤثر نہیں۔ کیونکہ ان کے دماغوں کے اندر مختلف نظریات، اقدار اور خیالات نے ڈیرے جما رکھے ہوتے ہیں۔ کہیں ڈارون ازم ہے تو کہیں مارکسزم، کہیں Logical Positivism ہے اور کہیں Existentialism ہے۔ نامعلوم اس طرح کے کتنے بے شمار ازم ہیں، ان کا توڑ آپ کو کرنا پڑے گا، اور وہ توڑ دلائل و براہین کے ساتھ کرنا ہوگا۔ ان کا دماغ ایک حجاب ہے جس کے باعث آپ ان کے دل تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے دماغ میں ان نظریات نے ایک رکاوٹ (Barrier) کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ پہلے اس رکاوٹ کو توڑ کر اس کے اندر سے گزرنا ہوگا۔ اس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان سے اسی سطح پر بات کر سکیں۔ اور یہ اسی صورت میں ہوگا جبکہ وہ ان نظریات سے کماحقہٗ واقف ہوں اور وہ ان پر ایسی معقول تنقید کر سکیں جو مدلل اور منطقی ہو۔ وہاں فتویٰ سے کام نہیں چلے گا، وہاں تو دلائل سے بات کرنا ہوگی، اس لیے کہ قرآن وحدیث کو تو وہ مانتے ہی نہیں۔ جب تک یہ کام نہیں ہوتا آپ اس Intelligentsia کو قائل نہیں کر سکتے۔

سو فیصد تو کوئی بھی قوم تبدیل نہیں ہوتی، لیکن قوم کی واضح اکثریت کے نظریات کو تبدیل کرنے کے لیے اس ذہین طبقہ کے اندر ایسا مضبوط نیوکلیئس پیدا ہونا ضروری ہے

جوعلیٰ وجہ البصیرت اللہ، آخرت اور نبوت و رسالت پر یقین رکھتا ہو، جسے اسلام پر پورا شرحِ صدر حاصل ہو اور وہ اپنی دعوت کے ذریعے ان کے نظریات کی نفی کرے۔ جیسے امام غزالیؒ نے ''تهافت الفلاسفه'' لکھی یا امام ابن تیمیہؒ نے ''الرد علی المنطقيين'' لکھی تو انہوں نے اہل فلسفہ و منطق سے اپنا لوہا منوایا۔لیکن اس کے لیے پہلے غزالی بننا پڑے گا اور پہلے امام ابن تیمیہ کے مقام تک رسائی حاصل کرنا ہو گی۔ اور یہ زندگی بھر کی جدوجہد ہے۔ دنیا میں بڑے شاندار کیریئر ہیں، اچھی تنخواہیں مل رہی ہیں، مراعات حاصل ہیں، ان سب کو چھوڑ کر فکر انسانی کا تجزیہ کر کے فکر انسانی کی تاریخ کا جائزہ لینا ہو گا اور موجودہ فکر کا صغریٰ کبریٰ جوڑنا ہو گا کہ اس میں کہاں ٹیڑھ یا خرابی آئی ہے۔ ظاہر بات ہے باطل محض تو کوئی نظریہ بھی نہیں ہے، باطل محض کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ باطل ہمیشہ حق کے کسی جزو کو لے کر اس پر اپنا تانا بانا بنتا ہے۔ باطل اس کے بغیر کھڑا رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ تو حق کا کوئی جزو لیتا ہے اور اس پر باطل کے ردّے چڑھاتا ہے، اس کے بل پر وہ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ آپ کو یہ تجزیہ کرنا پڑے گا کہ اس میں حق کتنا ہے اور باطل کتنا ہے، صحیح کتنا ہے اور غلط کتنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾

(یوسف:۱۰۸)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ لوگو! یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی''۔

میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں۔

علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر اس بصیرت کی روشنی میں ان تمام علوم و افکار کا تجزیہ کرنا آسان کام تو نہیں۔ اس میں اپنے آپ کو بالکلیہ لگا دینا پڑے گا۔ یہ تو پوری زندگی کا عمل ہے۔ دنیاوی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جب مارکس اپنی کتاب ''داس کیپٹل'' لکھ رہا تھا تو اسے فاقوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بھی کوئی تخلیقی (Creative) کام ہوا ہے تو وہ فاقوں کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ بڑے بڑے تحقیقی

اداروں کی طرف سے تنخواہیں مل رہی ہوں، اس طرح کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا کرتا، ہاں تحقیقی کام ہو جاتے ہیں کہ کوئی پرانا مخطوطہ لے کر اس کی ایڈیٹنگ کر دی اور اس کی احادیث کی تخریج کر دی تو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لی۔ دنیا میں جہاں بھی تخلیقی کام ہوئے ہیں وہ فقر و فاقہ کے ساتھ ہوئے ہیں۔

۲ دعوت **بالحکمۃ** کے بعد دوسرا درجہ موعظۂ حسنہ کا ہے، جس کے مخاطب عوام الناس ہوتے ہیں، جن کے ذہن خالی سلیٹ کی مانند ہیں، آپ جو چاہیں اس پر لکھ دیں۔ ان لوگوں کے دل و دماغ میں کوئی خناس نہیں اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈارون کس بلا کا نام ہے اور فرائڈ کس چڑیا کا نام ہے۔ ان کے لیے تو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' والا معاملہ ہے کہ جو بات آپ کہیں گے اور وہ بات آپ کے دماغ سے نہیں بلکہ آپ کے دل سے نکلی ہو، چاہے وہ مرصع زبان میں نہ بھی ہو، ٹوٹی پھوٹی زبان میں ہو، لیکن خلوص کے ساتھ دل سے نکلی ہوئی ہو تو وہ دل میں سیدھی اتر جائے گی۔

اس کے لیے دوسرا تقاضا پھر یہ ہے کہ آپ جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں اس کا خود بھی نمونہ ہوں:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۳۳﴾ (حم السجدة)

''اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں خود بھی فرمانبرداروں میں سے ہوں''۔

آپ اس پر اپنی شخصیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کیجیے، بلکہ کہیں کہ میں بھی ایک ادنیٰ مسلمان ہوں۔ یہ دعوت ''**بالموعظة الحسنة**'' عوام الناس کیلئے ہے اور یہ انتہائی مؤثر ہے، اس کا بہت فائدہ ہے۔ اگرچہ جب تک ایک معاشرے کے اُس intelligentsia یا ذہین اقلیت (intellectual Minority) یا Brain Trust میں ایک مضبوط نیوکلیئس قائم نہیں ہوگا اُس وقت تک معاشرے میں بحیثیت مجموعی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ دعوت کے نتیجے میں اگر لاکھوں عوام کے اندر تبدیلی آجائے، ان کی زندگی کے شب و روز بدل جائیں،

ان میں نماز روزے کا اہتمام ہو جائے اور وہ اپنی وضع قطع بھی صحیح کرلیں، لیکن اگر اُوپر کے Brain Trust یا intelligentsia میں ایک مضبوط نیوکلیئس موجود نہیں ہے اور اس نے اپنے آپ کو منوا کر معاشرے پر اپنی چھاپ نہیں ڈال دی اور دوسرے لوگوں پر اتمامِ حجت نہیں کر دیا تب تک معاشرہ بحیثیت مجموعی کسی تبدیلی کو قبول نہیں کرے گا۔

③ دعوت کا تیسرا درجہ ''جدال حسنہ'' کا ہے ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ ''اور ان سے جھگڑا کرو بڑے عمدہ طریقے سے''۔ یہ جدال کن لوگوں کے خلاف ہوگا؟ ظاہر ہے ؏ ''ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب!'' کے مصداق اس معاشرہ میں صرف آپ ہی دعوت و تبلیغ میں سرگرم نہیں ہیں، یہاں عیسائی مشنریز بھی کام کر رہی ہیں، قادیانی مبلغین اور بہائی بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ آپ کو مجادلہ کرنا پڑے گا۔ ان لوگوں نے اس کام کو بطورِ پیشہ اپنایا ہے اور انہیں اس کی تنخواہ ملتی ہے۔ وہ اس کام کے لیے پوری طرح تیاری کرتے ہیں اور تربیت لیتے ہیں۔ چنانچہ دعوت و تبلیغ کے میدان میں ان سے جدال یعنی بحث و مباحثہ کرنا پڑے گا تاکہ ان کو چپ کرایا جا سکے، ورنہ عوام الناس پر ان کا اثر ہوگا۔ اس کے لیے ہمارے ہاں خاص طور پر مناظرہ کا فن بنا ہے۔ مناظرہ میں یہ پیشِ نظر نہیں ہوتا کہ اپنے مخاطب مدمقابل کو قائل کیا جائے، بلکہ اسے خاموش کرانا پیشِ نظر ہوتا ہے اور اس کے لیے بعض حضرات نے آیت قرآنی سے دلیل اختیار کی ہے:

﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ......﴾ (العنکبوت:۴۶)

''اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے، سوائے ان لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہوں''۔

تو معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ مجادلہ کے ذرا سخت انداز یعنی مناظرہ کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں اس مناظرہ کے فن نے جنم لیا۔ گزشتہ صدی میں ہمارے ہاں نوآبادیاتی حکمرانی کا جو دَور تھا وہ مسلمانوں کے لیے بہت شکست خوردہ اور مرعوبیت کا دور تھا۔ اس کے دوران ہندوستان بھر میں مشنریز کا سیلاب آ گیا۔ اُس وقت ایک انگریز پادری ''فنڈر'' آیا

جو کلکتے سے شروع ہو کر دہلی تک پہنچ گیا اور اس نے تمام بڑے بڑے شہروں میں مسلمان علماء کو مناظروں کے اندر شکست دی، جس سے ہندوستان بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ دہلی آ کر اس نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں کلکتے سے چل کر یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور کوئی مسلمان عالم دین میرا مقابلہ نہیں کر سکا، میں بہت سے علماء کو شکست دے کر آیا ہوں، اور اب میں پورے ہندوستان کے علماء کو چیلنج کر رہا ہوں کہ اگر کسی میں ہمت ہے تو میرے مقابلے میں آئے۔ ذرا سوچئے کہ اگر اُس وقت اس کے مقابلے میں کوئی نہ آتا تو عوام پر کیا اثر ہوتا۔ ایک طرف سیاسی محکومی اور اس کی مرعوبیت تھی، دوسری طرف ہمارے علماء اس پادری کے مقابلے میں خاموش تھے، ان کے پاس کوئی دلیل ہی نہیں تھی۔ رہے عوام تو ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ قرآن سے واقف تھے نہ حدیث سے اور نہ انہیں عربی زبان کی کوئی شدبد تھی۔ ان کا تکیہ تو علماء پر تھا، اگر ان میں سے کوئی بھی خم ٹھونک کر اُس کا مقابلہ نہ کرتا تو پھر یہاں عیسائیت کا ایک سیلاب آ جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ میدان میں آئے اور انہوں نے اس سے مناظرہ کر کے اسے شکست دی، جس کے بعد وہ ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لگتا ہے غیرت مند آدمی تھا جو یہاں نہیں رکا پھر اس نے ترکی میں جا ڈیرہ لگایا۔ رحمت اللہ کیرانویؒ صاحب حج کے لیے گئے ہوئے تھے اور حجاز کا علاقہ اس وقت خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں تھا۔ انہیں وہاں خلافت عثمانیہ کا پیغام موصول ہوا کہ آپ ترکی تشریف لائیے یہاں پر اسی پادری نے جسے آپ نے ہندوستان میں شکست فاش دی تھی ہمارے علماء کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ جب اسے علم ہوا کہ رحمت اللہ کیرانوی آ رہے ہیں تو وہ وہاں سے بھی بھاگ گیا۔ عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات میں مولانا نے ''اظہار الحق'' کے نام سے کتاب لکھی تھی، پھر جس کا خود ترجمہ بھی کیا اور اس پر حواشی بھی لکھے۔ اس کتاب پر مفتی تقی عثمانی صاحب نے بھی کچھ نوٹس لکھے ہیں۔ بہر حال مجادلہ و مناظرہ بھی دعوت کے ضمن میں ایک اہم ضرورت ہے، لیکن عام طور پر ''دعوت'' کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے مخاطب کو اچھے اور خوبصورت انداز میں قائل کرنے کی کوشش کریں۔

''دعوت'' یا ''باطل عقائد ونظریات کے خلاف جہاد'' کے یہ جو تینوں مراحل میں نے بیان کیے ہیں، ظاہر ہے اس کے لیے محنت کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے پہلے آپ خود علم حاصل کریں گے، اسے آگے پہنچائیں گے۔ اسلام پر آپ کو جب شرح صدر حاصل ہوگا تب ہی آپ اسلام کی دعوت دیں گے۔ جب آپ کو علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہوگا تب ہی آپ کسی کو اس طرف بلائیں گے۔ لہٰذا اس کے لیے محنت، کوشش اور جدوجہد کرنا، تیاری کرنا اور علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں یہ حدیث پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ جَآءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ))(۱۴)

یعنی جس شخص کو اس حالت میں موت آ گئی کہ وہ ابھی علم کے حصول میں لگا ہوا تھا، لیکن اس کی نیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے گا، تو اس کے اور انبیاء کے درمیان جنت میں صرف ایک درجے کا فرق رہ جائے گا''۔ غور کیجیے کہ ابھی اس کی عملی جدوجہد شروع نہیں ہوئی، لیکن اس کی نیت یہ ہے کہ اسلام کو زندہ کرنا ہے، اسلام کو غالب کرنا ہے، اس کے غلبے کی جدوجہد میں اپنے آپ کو لگانا ہے اور اس کے لیے مجھے علم درکار ہے، جب تک میں علم کے ہتھیار سے مسلح نہ ہو جاؤں تو دعوت وتبلیغ کا کام کیسے ہوگا، تو ایسے شخص کے لیے کتنی بڑی بشارت ہے!

قرآن بحیثیت آلۂ جہاد

جہاد فی سبیل اللہ کی ان دو منزلوں (جہاد مع النفس اور دعوت) پر جہاد کے لیے ہتھیار صرف ایک ہے اور وہ قرآن ہے۔ نفس کے خلاف جہاد کے لیے بھی آپ کو جو تلوار درکار ہے وہ قرآن ہے۔ اگر آپ کے وجود میں شیطان سرایت کر سکتا ہے تو قرآن مجید بھی آپ کے وجود میں سرایت کر جائے گا۔ زہر کا اثر اگر جسم میں کسی ایک جگہ ہو تو اس کا مقامی طور پر علاج کفایت کرے گا، لیکن زہر اگر پورے جسم میں پھیل گیا ہو تو آپ کو وہ تریاق چاہیے جو

پورے جسم کے اندر پھیل سکے اور وہ صرف قرآن ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اسے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی!
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!!

اس شعر میں دو حدیثوں کے مفہوم کو جمع کر لیا گیا ہے۔ ایک تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ کیا آپؐ کے ساتھ بھی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا ہاں ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ آپؐ کے فرمان کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ میں اس کی ایذاء سے امن وسلامتی میں ہوں اور وہ مجھے گزند نہیں پہنچا سکتا۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ شیطان تو انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مفاہیم کو علامہ اقبال نے اپنے ان دو اشعار میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ابلیس کو ہلاک کر دینا مشکل کام ہے، وہ تو دل کی گہرائیوں میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ پورا دورانِ خون تو دل ہی کی وجہ سے ہے، لہٰذا وہ خون کے ساتھ انسان کے جسم میں گردش کرتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسے مسلمان بناؤ! اور یہ مسلمان ایسے بنے گا کہ قرآن کی شمشیر سے اس کا قلع قمع کرو!

یہ قرآن انسان کے قلبی، باطنی اور روحانی امراض یعنی حسد، تکبر، بغض، عناد، حبِ مال، حبِ جاہ کے لیے شفا ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ یونس میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٥٧ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝٥٨﴾ (یونس)

''لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور

رحمت ہے۔اے نبیؐ! کہو کہ یہ اللہ کا فضل اوراس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی۔پس یہ وہ چیز ہے جس پر لوگوں کو خوشی منانی چاہیے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں‘‘۔

چنانچہ شیطان کے خلاف جہاد کے لیے بھی ہتھیار قرآن ہے اور اپنے نفس کے خلاف جہاد کے لئے بھی ہتھیار قرآن ہی ہے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ حکمت کا منبع اور سرچشمہ بھی قرآن ہی ہے۔قرآن کے اندر غواصی کیجیے، غور وخوض کیجیے،اس میں غوطہ زنی کیجیے۔ع

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان!

مولانا روم نے کہا تھا کہ:

چند خوانی حکمت یونانیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں!

یعنی تم کب تک یونانیوں کا فلسفہ پڑھتے رہو گے، کبھی حکمت قرآنی اور حکمت ایمانی بھی تو پڑھو! قرآن کہتا ہے ﴿ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل:۳۹) ’’اے نبیؐ! یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو آپ کے ربّ نے آپ کی طرف نازل کی ہیں‘‘۔اور حضور ﷺ کی تعلیم وتربیت کی بلند ترین منزل یہی حکمت ہے ﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾۔ نبی اکرم ﷺ کے بنیادی طریق کار یا انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کے عناصر چہارگانہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر بیان ہوئے ہیں ان میں تین مقامات پر ترتیب یہی ہے صرف ایک مقام پر ذرا بدلی ہوئی ہے جو حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی دعا پر مشتمل ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ﴾ (البقرۃ:۱۲۹)

لیکن بقیہ تینوں مقامات پر، جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات آئی ہے، ترتیب اس طرح ہے (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب (۴) تعلیم حکمت ۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴿۱۵۱﴾﴾

پھر سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴿۱۶۴﴾﴾

سورۃ الجمعہ میں یہ عناصر چہارگانہ بایں الفاظ بیان ہوئے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴿۲﴾﴾

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے حکمت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اس کے لیے قرآن مجید کی طرف ہمارا رجوع نہیں رہا، جو حکمت کا سب سے بڑا منبع و سرچشمہ ہے۔ پھر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت طویل عرصے تک ''حکمت'' تو درحقیقت حکمتِ یونان ہی کو قرار دیا جاتا رہا ہے۔ وہیں کے فلسفہ اور منطق نے ہمارے ہاں فروغ پایا اور عام طور پر ہمارے بڑے سے بڑے علماء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوئے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ وہ تو چند لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ''توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری'' کے مصداق پیدا کرتا ہے۔ امام غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ تو بہرحال ایک ہی بار پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ بھی روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں عام طور پر تصور یہی رہا ہے کہ حکمت تو وہی ''حکمت یونانیاں'' ہے۔ چنانچہ عالمِ اسلام میں ارسطو کی منطق کا صدیوں تک ڈنکا بجتا رہا۔ ابنِ سینا، فارابی، الکندی اور ابنِ رشد کون تھے؟ یہ سب کے سب ارسطو کی منطق کے ڈسے ہوئے تھے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے!

اس حوالے سے حکمت کا منبع و سرچشمہ بھی قرآن مجید ہے، پھر یہ کہ موعظہ حسنہ بھی قرآن ہے، اور جدال کے لیے سارا مواد بھی قرآن حکیم میں موجود ہے۔ کفار و مشرکین، ملحدین اور مادہ پرستوں کے خلاف جدال کے دلائل قرآن میں موجود ہیں۔ گویا جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی

اور دوسری منزل پر جو ہتھیار درکار ہے وہ قرآن ہے۔

اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں منزلوں پر کسی جماعت کی ضرورت نہیں یہ کام انفرادی طور پر بھی ہوسکتا ہے۔ ایک شخص اپنے نفس اور اپنے شیطان کے خلاف جہاد خود کر سکتا ہے، اس کے لیے جماعت لازم نہیں۔ اسی طرح ایک شخص داعی بن کر کھڑا رہے اور لوگوں کو اللہ کا بندہ بننے کی دعوت دیتا رہے تو یہ کام وہ انفرادی حیثیت میں کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اعلیٰ مثال حضرت نوح علیہ السلام کی موجود ہے جو ساڑھے نو سو برس تک قوم کو دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ یہ کام انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ پہلی منزل پر اگر کچھ ایسے لوگوں کی صحبت نصیب ہو جائے جو اسی کشاکش میں لگے ہوئے ہوں تو ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ''سچے لوگوں کے ساتھ رہو'' (التوبہ:119) کے مصداق ان کی معیت اور صحبت اختیار کی جانی چاہیے۔ وہ صادقین کون ہیں؟ قرآن کے الفاظ میں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

(الحجرات)

''یقیناً مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر شک میں نہ پڑے، اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی سچے لوگ ہیں''۔

چنانچہ اگر آپ ایسے صادقین کی تلاش کر کے ان کی صحبت حاصل کریں اور ان کے ساتھ رہیں، اس سے یقیناً آپ اُن کا رنگ اختیار کریں گے۔ لیکن لازم نہیں ہے کہ کوئی منظّم جماعت ہو۔ اسی طرح دعوت وتبلیغ کا جہاد انفرادی طور پر بھی ہوسکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے یہ کام خالص انفرادی طور پر کیا، ان کی نہ کوئی انجمن تھی نہ ادارہ تھا۔ لیکن اگر اس معاملے میں کوئی انجمنیں، درس گاہیں یا ریسرچ کے ادارے وجود میں آ جائیں تو یقیناً یہ مفید ہوگا۔ اور اس کام کی کسی حد تک ضرورت بھی ہے کہ ایسے اشاعتی ادارے قائم ہوں جو مختلف زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم اور تشریحی نوٹس مرتب کرنے کا کام کریں۔

③ جہاد کی بلند ترین منزل ’’اقامت دین‘‘

جہاد فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل نظام کی سطح پر جہاد، یعنی نظام کو بدلنے کی جدوجہد ہے۔ یہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے باطل نظام اور طاغوت کے خلاف جہاد ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید میں مختلف اصطلاحات آئی ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح ’’تکبیر ربّ‘‘ ہے۔ فرمایا ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ یعنی اپنے ربّ کی کبریائی کا نظام قائم کرو، اپنے ربّ کی تکبیر کرو۔ اپنے ربّ کو بڑا کرو۔ کیا معنی؟ ربّ تو خود بڑا ہے اس کو کیسے بڑا کیا جائے؟ وہ بلاشک وشبہ بڑا ہے، لیکن اس کی بڑائی مانی نہیں جا رہی۔ اس کی بڑائی منواؤ! سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات میں سے دوسری آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل کا ذکر ہے اور پھر تیسری آیت میں تیسری منزل کا ذکر ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ’’اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو!! اور اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو!!!‘‘ یعنی دعوت کا انداز انذار سے کرو اور پھر اپنے ربّ کی کبریائی قائم کرو۔

اس ضمن میں دوسری اصطلاح ’’اقامت دین‘‘ کی ہے۔ فرمایا:

﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

’’کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ‘‘۔

تکبیر ربّ اور اقامتِ دین ہم معنی اصطلاحیں ہیں۔

قرآن حکیم میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت تین مرتبہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ......﴾ (التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے (یا تمام ادیان پر غالب کر دے)‘‘

اس ضمن میں سورۃ الانفال (آیت ۳۹) میں فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

''حکومت الٰہیہ اور ان (کفار و مشرکین) سے اُس وقت تک قتال کرو جب تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور نظام کُل کا کُل اللہ کے حکم کے تابع ہو جائے''۔

اسی کو جدید اصطلاح میں ''اسلامی انقلاب'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حکومتِ الٰہیہ'' کے قیام کا نعرہ لگایا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جب اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور جماعت اسلامی قائم کی تو حکومتِ الٰہیہ ہی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اسی نظریئے پر علامہ مشرقی اور خیری برادران نے بھی کام کیا۔

پی این اے کی اینٹی بھٹو تحریک میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح اپنائی گئی۔ اسی کے لیے نظامِ اسلامی اور نظامِ خلافت کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں، جن کا مفہوم ایک ہی ہے ع ''عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ'' (ہماری عبارتیں مختلف ہیں، لیکن اے اللہ! تیرا حسن و جمال تو اپنی جگہ ایک وحدت ہے۔)

اس ضمن میں استعمال ہونے والی اصطلاحات میں سے بعض اعتبارات سے اہم ترین بائبل کی اصطلاح ''Kingdom of Heaven on the Earth'' (زمین پر آسمانی حکومت کا قیام) ہے۔ ان کی Lord's Prayer کے الفاظ ہیں:

Thy Kingdom Come,
Thy will be done on earth
as it is in heavens.

''اے رب! تیری حکومت قائم ہو، اے ربّ! جس طرح تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہو رہی ہے اسی طرح زمین پر پوری ہو!''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشہور جملہ ہے۔ Repent for the kingdom of heaven is at hand ''توبہ کرو، اس لیے کہ آسمانی بادشاہت آیا چاہتی ہے!'' یہ اشارہ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف تھا۔ آسمانی بادشاہت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے قائم ہوئی ہے۔ بہرحال اس ضمن میں بے شمار اصطلاحات موجود ہیں۔

اقامت دین کی شرطِ لازم: منظّم جماعت

اقامت دین کے مراحل بیان کرنے سے پہلے اس کی شرطِ لازم جان لیجیے۔ جہاد فی

سبیل اللہ کی پہلی دو منزلوں پر اصل ہتھیار قرآن ہے اور ان دونوں سطحوں پر کسی منظّم جماعت کا ہونا لازمی نہیں، لیکن تیسری منزل کے لیے لازم ہے ایک ایسی منظّم جماعت وجود میں آئے جو اسی دعوت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو۔ یہ نہیں کہ قومی بنیاد پر کوئی گروہ منظّم ہو جائے اور قومی سطح پر کوئی جدوجہد شروع ہو جائے۔ بلکہ جو لوگ بندگیٔ ربّ اور شہادت علی الناس کی دعوت شعوری طور پر قبول کر کے آئیں ان پر مشتمل ایک منظّم جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح نماز کے لیے وضو شرط ہے ایسے ہی اقامت دین کے لیے ایک منظّم جماعت کا ہونا شرطِ لازم ہے۔ وہ جماعت ایسے لوگوں کی ہو جنہوں نے اسلام اور ایمان کو شعوری طور پر قبول کیا ہو، جو اپنے نفس سے جہاد کی منزل سر کر کے آئے ہوں اور اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے تابع کر چکے ہوں۔ ایسے لوگ منظّم جماعت کی شکل میں جمع ہوں۔ یہ شرط اگر پوری نہیں ہوتی تو پھر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی منزل نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جہاد فی سبیل الحریۃ یا کوئی اور جہاد ہو جسے جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا ہو۔

جماعت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ((**يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ**))(۱۵) ’’اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے‘‘ اور ((**عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ**))(۱۶) ’’تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے‘‘۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((**اِنَّهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ**))(۱۷)

’’یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے، اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے، اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت بھی نہ ہو‘‘۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پوری امت ایک جماعت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کا امام کون ہے؟ اگر امیر موجود نہیں ہے تو پھر جماعت نہیں ہے۔ علامہ اقبال، جو وحدتِ اُمت کے حدی خواں تھے، آخر کار انہیں اپنے خطبات میں یہ کہنا پڑا کہ اس وقت دنیا میں اُمت مسلمہ موجود نہیں ہے، بلکہ بہت سی مسلم اقوام موجود ہیں۔ اسی طرح آج ہم یہ کہیں گے کہ دنیا میں بہت سے مسلم ممالک ہیں اور مسلمان ملک ہونے کے ناطے ان کے حقوق ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کچھ حقوق ہیں۔ یہ

حقوق اپنی جگہ مسلّم ہیں، لیکن دنیا بھر کے مسلمان ایک جماعت تو نہیں ہیں۔ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوٹوک انداز میں فرما دیا تھا کہ ((لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ)) یعنی ''امارت کے بغیر کوئی جماعت نہیں''۔

اس موضوع پر ذروۂ سنام یہ حدیث ہے جو حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ ، اللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ ، بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱۸)

''اے مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے ① التزامِ جماعت ② سننا ③ اطاعت کرنا ④ ہجرت اور ⑤ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا''۔

یعنی جماعت بھی وہ مطلوب ہے جو سمع و طاعت (Listen and obey) والی ہو۔ یہ جماعت ہجرت و جہاد کے مراحل طے کرے گی۔ ہجرت کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا ''اَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' ''اے اللہ کے رسولؐ! افضل ترین ہجرت کون سی ہے؟'' فرمایا ((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ)) (۱۹) ''(افضل ترین ہجرت یہ ہے) کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو اللہ کو پسند نہیں''۔ پوچھا گیا ''اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟'' ''افضل جہاد کون سا ہے؟'' تو فرمایا ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) ''(افضل جہاد یہ ہے) کہ تم اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرو اور اسے اللہ کی اطاعت کا خوگر بناؤ''۔ اس نکتہ پر ہجرت اور جہاد باہم جڑ جاتے ہیں۔ ہر اس شے کو چھوڑ دینا جو اللہ کو ناپسند ہے اور اپنے نفس کو اللہ کے حکم کا تابع بنانے کی جدوجہد درحقیقت ایک ہی شے ہے۔ چنانچہ ہجرت اور جہاد ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ حرام شے کو چھوڑ دینا ہجرت ہے اور اپنے نفس کو اس بات کے لیے تیار کرنا اور اسے مجبور کرنا کہ وہ حرام کو چھوڑ دے، یہ بھی جہاد ہے۔ اس سطح پر ہجرت اور جہاد دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ تیسری منزل کا جہاد (جو خود تین درجات پر مشتمل ہے) جب اپنی بلند ترین چوٹی پر پہنچتا ہے تو اُس وقت اللہ کی خاطر اپنا گھر بار، خاندان سب کچھ

چھوڑ کر دارالاسلام میں آ جانا ہجرت کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں یہ مرحلہ ''ہجرتِ مدینہ'' کی صورت میں آیا۔ ہجرتِ مدینہ مسلمانوں پر فرض تھی اور جنہوں نے ہجرت نہیں کی انہیں منافق قرار دیا گیا اور ان کے کوئی حقوق مسلمانوں پر نہیں رہے۔ بحوائے ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَالَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا﴾ (الانفال:۷۲) ''رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو اُن سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں''۔ ہجرت کے بغیر تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کے کوئی حقوق اور ذمہ داری تم پر نہیں۔ تو یہ ہجرت لازم ہے۔ دوسری طرف جہاد فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل قتال ہے۔ اس طرح اوپر جا کر یہ ہجرت اور جہاد ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گے۔

اقامت دین کے مراحل

جہاد فی سبیل اللہ کی تیسری منزل یعنی ''اقامت دین'' کی جدوجہد کے لیے ایک منظّم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ جماعت دراصل اس جہاد کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہونی چاہیے جو جہاد فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل سے گزر کر آئے ہوں۔ یعنی اپنے نفس کے خلاف جہاد کر کے اسے اللہ کا مطیع بنا چکے ہوں۔ یہ جماعت اپنے کارکنوں کی مزید تربیت کرے گی۔ پھر یہ دوسری منزل کا جہاد یعنی دعوت و تبلیغ کا حق ادا کرے گی۔

① صبرِ محض: اس کے بعد یہ جماعت اب انقلابی مرحلے اقامت دین کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کرے گی تو پہلا مرحلہ صبرِ محض (Passive Resistance) ہو گا، اس لیے کہ ماحول مخالفت کرے گا۔ پہلے زبانی اور پھر جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا، پاگل اور دیوانہ کہا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے یہ ساری باتیں رسول اللہ ﷺ سے کہی گئیں۔ حضور ﷺ کو مجنون، شاعر، ساحر اور مسحور کہا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے ایک عجمی غلام گھر میں بند کیا ہوا ہے، اس سے dictation لیتے ہیں، تورات اور انجیل کی باتیں اس سے سیکھتے ہیں اور ہم پر آ کر دھونس جماتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی آئی ہے۔ حضور ﷺ کو یہ ساری باتیں سننی پڑیں۔ زبانی طور پر ایذا رسانی کے بعد پھر جسمانی تشدد کا دور شروع ہوا۔

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو بھی اس کا نشانہ بننا پڑا۔ خاص طور پر نوجوانوں اور غلاموں کو بدترین جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ غلاموں پر ان کے آقاؤں اور نوجوانوں پر ان کے بزرگوں کو حق حاصل تھا کہ جو چاہیں کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاندان بنی اُمیہ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے چچا نے انہیں چٹائی کے اندر لپیٹ کر دھواں دے دیا، جس سے آپؓ کا دم گھٹنے لگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ماں نے مرن بھرت☆ رکھ لیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ برہنہ کر کے گھر سے نکال دیئے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے اسی لیے اپنی زوجہ محترمہ (حضور ﷺ کی صاحبزادی) کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غلاموں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن اُس دَور میں حکم تھا کہ "کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ"، یعنی اپنے ہاتھ روکے رکھو۔ اس لیے کہ تمہیں ابھی وقت چاہیے۔ ابھی تم تھوڑے ہو اور تمہارا Base بڑا محدود ہے تم اگر اس حالت میں مزاحمت کرو گے تو کچل دیے جاؤ گے۔ تمہیں ابھی وقت چاہیے اور اس وقت کے لیے صبر کرو، اپنے ہاتھ روکے رکھو، چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں یا زندہ بھون دیا جائے۔ اپنے دفاع میں بھی ہاتھ مت اٹھاؤ۔ یہ 'صبر محض' ہے۔ مکی دَور میں کم از کم آٹھ برس تک یہ مرحلہ جاری رہا۔ ابتدائی چار سال اس مرحلے میں شامل نہیں تھے بلکہ جسمانی تشدد کا آغاز چوتھے سال سے ہوا ہے۔ چنانچہ پورے آٹھ یا نو برس تک کسی تشدد کا جواب نہیں دیا گیا اور ہاتھ بندھے رکھے گئے۔

انقلابی جدوجہد میں صبر محض کی حکمت عملی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی خاموش اکثریت (Silent Majority) کی ہمدردیاں ان انقلابی افراد کی طرف منعطف# ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ لوگ باہم باتیں کرتے ہیں دیکھو" اُمیہ بن خلف نے حضرت بلال ﷺ کو اس طرح وحشیانہ طور پر مارا ہے کہ اس طرح حیوانوں کو بھی نہیں مارا جاتا"۔ کیا بلالؓ نے کہیں چوری کر لی تھی یا اس کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا؟ نہیں وہ تو صرف یہ کہتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ خاموش اکثریت خاموش تو ہوتی ہے لیکن وہ اندھی یا بہری تو نہیں ہوتی، اگرچہ وہ بول نہیں سکتی

☆ تادمِ مرگ بھوک ہڑتال　　# مائل ہونا، متوجہ ہونا

کیونکہ اس میں اس کی ہمت و جرأت نہیں ہوتی کہ ظالم سے پوچھ سکے کہ کیا کر رہے ہو؟ لیکن وہ اندھی، بہری یا گونگی تو نہیں ہوتی۔ وہ دیکھ اور سن رہی ہوتی ہے۔ نتیجتاً ان کی ہمدردیاں اندر ہی اندر انقلابی جماعت کے افراد کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ع ''جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ!'' کسی انقلابی جدوجہد میں Passive Resistance کا دَور انتہائی مؤثر اور فیصلہ کن ہوتا ہے اور آئندہ کی کامیابیوں کی ضمانت یہیں سے ملتی ہے۔

④ اقدام: اگلے مرحلے میں اس انقلابی جماعت کی قیادت جب یہ محسوس کرے کہ اب ہم مضبوط ہیں، ہماری تعداد بھی کافی ہے، کارکنوں کی تربیت بھی صحیح ہوئی ہے، انہوں نے اپنے نفس کو قابو میں کر لیا ہے، ان کی نیتیں بالکل خالص ہو چکی ہیں، ان کی جدوجہد خالصتاً لِوَجہِ اللہ ہے اور وہ ﴿یَدۡعُوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡھَہٗ﴾ کا مصداق بن چکے ہیں، ان کی کیفیت یہ بن گئی ہے کہ وہ منظّم ہیں، سمع و طاعت پر کاربند ہو چکے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، تو اب اقدام کیا جائے اور آگے بڑھ کر اس نظامِ باطل کو چھیڑا جائے۔ چھیڑنے کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تجارتی شاہراہ کو، جس پر ان کے قافلے آتے جاتے تھے، مخدوش بنا دیا اور اس طرح ان کی معاشی ناکہ بندی کی۔ دوسری طرف ان کی سیاسی ناکہ بندی کا انتظام اس طرح فرمایا کہ آپؐ نے مختلف قبائل سے معاہدے شروع کر دیے۔ چنانچہ وہ قبائل جو پہلے قریش کے حلیف تھے اب یا تو حضور ﷺ کے حلیف ہو گئے یا پھر غیر جانبدار ہو گئے کہ ہم نہ ان کا ساتھ دیں گے نہ آپؐ کا ساتھ دیں گے۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کے سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ بڑھتا گیا اور قریش کا دائرہ گھٹتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قریش کی طرف سے تنگ آمد بجنگ آمد کا معاملہ ہوا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کا ایک ہزار کا لشکر نکلا ہے۔ اس معاملے میں پہل یقیناً رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ جو اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں ان کا کام ہے کہ وہ باطل کو چھیڑیں گے، کیونکہ وہ باطل سے ٹکر لینا چاہتے ہیں۔ وہ اس درخت کو جڑ سے اکھیڑنا چاہتے ہیں، لہٰذا اسے ہلانا شروع کریں گے۔ جب ہی تو اس کا امکان ہو گا کہ اسے اُکھیڑا جا سکے۔

اب یہ باتیں واضح طور پر سامنے آنی چاہئیں۔اب علامہ شبلی اوران سے پہلے کا زمانہ گزر گیا جب ہمارے سیرت نگاروں کو اہل یورپ کے سامنے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنا پڑتا تھا۔مغرب کی طرف سے جہاد اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ ع ''بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' اور یہ کہ اسلام کی ساری تبلیغ تلوار سے ہوئی ہے۔اس پر ہمارے علماء کا انداز یہ ہوتا تھا کہ نہیں نہیں، حضورﷺ نے جنگ شروع نہیں کی، بلکہ جنگ ان پر ٹھونسی گئی تھی، آپ نے تو مدافعانہ جنگ کی تھی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔اللہ کا دین تو غالب ہونے کے لئے آیا تھا اور رسول اللہﷺ اسے غالب کرنے کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔''اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ'' (حق غالب ہوکر رہتا ہے، اسے مغلوب نہیں کیا جاسکتا۔) جب تک طاقت موجود نہیں اس وقت تک تو باطل کے غلبے کو برداشت کرنا پڑے گا، لیکن طاقت ہونے کے باوجود آپ باطل کے غلبے کو برداشت کرلیں تو آپ کے دین وایمان کی نفی ہو جائے گی۔اس حوالے سے جان لیجیے کہ صبر محض (Passive Resistance) کے بعد اقدام (Active Resistance) درحقیقت تیسری منزل کے جہاد کا دوسرا مرحلہ ہے۔

③ تصادم: جب آپ نے نظامِ باطل کو چھیڑ لیا اور ان کے مفادات پر جب ضرب پڑی تو وہ اٹھیں گے اور اپنے نظام کا دفاع کریں گے۔ چنانچہ وہ پوری قوت کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوں گے اور پھر بالفعل تصادم (Conflict) ہوگا۔

اس تصادم کی دو شکلیں ہیں۔ایک شکل وہ ہے جو ہمیں سیرتِ نبویؐ میں نظر آتی ہے۔ یہ قتال فی سبیل اللہ تھا، جس کے لیے حکم دیا گیا ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (البقرۃ:۱۹۰) ''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں''۔ اور فرمایا ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا﴾ (الحج:۳۹) ''اجازت دے دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں''۔اور فرمایا ﴿وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱۹۳) ''اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے''۔ اور آخری بار فرمایا

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) ''اور تم ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے''۔ یعنی پورا نظام اللہ کی حاکمیت کے تابع ہو جائے۔ اس میں پھر وہ مقامِ محبوبیت ہے جس کا ذکر سورۃ الصّف میں ہے۔ فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصف) ''اللہ کو تو محبت اپنے ان بندوں سے ہے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔ علامہ اقبال نے یہیں سے یہ اسلوب مستعار لیا ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

یہ بلندترین مقام ہے، جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی!

مقامِ بندگی اور ہے، مقامِ عاشقی اور ہے۔ عاشق تو وہ ہے جو اللہ کے دین کے غلبے کے لیے میدان میں آئے اور اپنا تن من دھن لگا دے۔ اس کے اندر اللہ کے لیے وہ غیرت وحمیت ہے کہ وہ حق کو مغلوب نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا ((اَيُبَدَّلُ الدِّيْنُ وَاَنَا حَيٌّ)) ''کیا دین میں تغیر وتبدل ہو جائے گا جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟'' یعنی میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوسکتا۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کے لیے اور کوئی نہیں نکلے گا تو میں تن تنہا نکلوں گا۔ یہ جذبہ درکار ہے۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

اے اللہ! فرشتوں سے تو تجھے اطاعت ہی مطلوب ہے۔ چنانچہ فرشتوں نے یہی تو کہا تھا کہ

﴿نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ”آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں“۔ہم آپ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔لیکن اس خاکی انسان سے تجھے کچھ اور ہی مطلوب ہے — اور وہ کیا ہے؟

چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی!

اپنی ذات کا تجھے اتنا احساس ہے کہ اگرچہ تو بے نیاز ہے، غنی ہے، مگر تو اپنے دوستوں کے خون سے چاہتا ہے کہ تیری توحید کی گواہی دی جائے۔ تیرے دوست اولیاء اللہ اپنے خون سے تیری گواہی دیں۔

بہرحال قتال فی سبیل اللہ دوطرفہ جنگ کی شکل ہے۔اس کا ایک نقشہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ﴾

”یقیناً اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں“۔

موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا متبادل

سیرت النبی ﷺ میں ہمیں تصادم کی جو صورت نظر آتی ہے وہ تو قتال یعنی دوطرفہ جنگ ہی کی ہے۔لیکن موجودہ حالات میں اس کی ایک یک طرفہ شکل بھی ہوسکتی ہے۔اس کو ایک اجتہادی رائے سمجھ لیجیے۔☆ ہمارے موجودہ حالات دَورِ نبویؐ کے حالات سے کئی اعتبارات سے مختلف ہیں۔ آج حکومتیں بہت طاقتور ہیں اور وہ باطل نظام کی محافظ ہیں۔ملک میں اگر جاگیرداری نظام رائج ہے تو حکومت میں جاگیردار بیٹھے ہیں، سرمایہ

☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی گرانقدر تالیف ”منہج انقلابِ نبوی ﷺ“ کے آخری باب میں اس سلسلے پر خوب شرح وبسط سے کلام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تحقیقی شان کی حامل ہے۔موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کے طریق کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

داری نظام میں سرمایہ دار حکومت سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ نظام کو بدلنا چاہیں گے تو وہ لوگ چونکہ حکومت پر فائز ہیں اس لیے وہ اپنے تمام تر وسائل آپ کے خلاف استعمال کریں گے۔ حکومت پر فائز ہونے کے ناطے مسلح افواج، ایئر فورس، پولیس اور پیرا ملٹری فورسز ان کے اختیار میں ہیں، جبکہ عوام نہتے ہیں۔ اس لیے یہ مقابلہ اتنا غیر مساوی ہو گیا ہے کہ قتال کا معاملہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ تاہم نوٹ کیجیے کہ یہ بہرحال جائز ہے، جہاں بھی اس کے قابل عمل ہونے کا امکان ہو وہاں فاسق و فاجر حکمرانوں سے قتال کیا جا سکتا ہے۔ اس کو کسی نے حرام نہیں کیا۔ یہ تو غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) کا موقف ہے کہ ''دین کے لیے حرام ہے اب دوستو قتال!'' قتال جہاں قابل عمل (feasible) ہو گا لازماً کیا جائے گا۔ لیکن اگر اُدھر قوت اتنی ہے اور ادھر عوام نہتے ہیں تو عوام کو اپنی طاقت کا اظہار عوامی سطح پر منظّم مظاہروں کی صورت میں کرنا ہو گا اور حکومت کے خلاف ایک تحریک مزاحمت اٹھانا ہو گی۔ یہ تحریک عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک ہو گی، جو بالآخر غیر مسلح بغاوت (Unarmed Revolt) کی صورت اختیار کرے گی۔ یہ غیر مسلح بغاوت یک طرفہ ہو گی، جس میں حصہ لینے والے خود جان دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن کسی کی جان کے درپے نہ ہوں۔ قتال اگرچہ دوطرفہ معاملہ ہے۔ لیکن اس میں بھی اصل شے تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہوتا ہے۔ تو جو شخص اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے میدان میں آ گیا ہے تو گویا کہ اس نے قتال کا تقاضا پورا کر دیا۔ قتال اگر یک طرفہ ہو اور غیر مسلح بغاوت کی صورت اختیار کرے تو اس میں حصہ لینے والوں کو پولیس اور فوج کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا، ان پر لاٹھی چارج ہو گا اور یہ جیلوں میں ٹھونسے جائیں گے۔ اگر لوگ اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو گویا انہوں نے وہ شرط پوری کر دی ہے کہ وہ اپنے خون سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اللہ تعالیٰ کے نظام کی سربلندی کی جدوجہد کی گواہی دینے کو تیار ہیں۔ اس حوالے سے یہ سول نافرمانی اور غیر مسلح بغاوت ''مسلح تصادم'' (Armed Conflict) کا بدل ہے۔

مقتول فی سبیل اللہ کا مقام

قتال فی سبیل اللہ کے مقام کو سمجھنے کے لیے مسلم شریف کی ایک حدیث ملاحظہ کیجیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ))(۲۰)

''جو (مسلمان) اس حال میں مرا کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی آرزو پیدا ہوئی تو اس کی موت ایک طرح کے نفاق پر واقع ہوئی''۔

یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کی زندگی میں یہ مرحلہ ہی نہ آئے، جیسے بعض صحابہ کرامؓ مکہ میں فوت ہو گئے اور ان کی زندگی میں قتال کا مرحلہ ہی نہیں آیا لیکن اس حدیث کی رو سے اللہ کے راستے میں قتال کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں ہونا ضروری ہے۔

اللہ کے راستے میں قتال کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دینے کی آرزو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کس درجے موجزن تھی اس کا اندازہ اس حدیث سے کیجیے۔ فرمایا:

((لَوَدِدْتُ اِنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۲۱)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں''۔

اس حدیث میں چار مرتبہ ''اُقْتَلُ'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ آرزو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ میں اللہ کی راہ میں بار بار قتل کیا جاؤں۔ ہم میں سے ہر شخص کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ اگر اس آرزو سے ہمارے سینے خالی ہوں تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت ہے؟

مقتول فی سبیل اللہ کا مقام قرآن مجید میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ﴾ (البقرۃ: ۱۵۴)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مُردہ مت کہو''۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾ (آل عمران)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو درحقیقت زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں''۔

اللہ کی راہ میں قتل ہونے والا تو زندہ ہے۔شہید کے لیے حساب کتاب کا مرحلہ نہیں ہے وہ تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔اللہ کی راہ میں قتال کا یہ مقام ہے۔ یہ وہ شہادت☆ ہے جو منزل پر منزل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور نویں منزل پر آ کر قتال فی سبیل اللہ کے مقام پر پہنچتی ہے۔ کچھ لوگ سیدھے چھلانگ لگا کر وہاں پہنچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔

مقتول فی سبیل اللہ ہونے کی سعادت ان لوگوں کا نصیب ہے جو اللہ کی راہ میں قتال (دوطرفہ جنگ) کرتے ہیں، اور اس سعادت میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جو یک طرفہ جنگ میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما اُس وقت قتل کر دیئے گئے جبکہ ابھی صبر محض (Passive Resistance) کا دور تھا اور قتال کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا، دوطرفہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ دوطرفہ جنگ شروع ہونے کے بعد جنھوں نے مرتبہ شہادت حاصل کیا یا اس سے پہلے ہی مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے، یہ دونوں اس سعادت میں شامل ہو جائیں گے۔ بہرحال جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی منزلوں کا ایک منظّم جماعت کے بغیر کوئی تصور نہیں۔

نظم جماعت کی مسنون اساس: بیعت سمع وطاعت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منظّم جماعت کی تنظیم کی بنیاد کیا ہو؟ اس کے لیے ہمیں جو مسنون، ماثور اور منصوص بنیاد ملتی ہے وہ بیعت سمع وطاعت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے یہ بیعت لی حالانکہ آپؐ اللہ کے رسول تھے اور جو بھی آپؐ پر ایمان لے آتا اس پر آپؐ کی اطاعت لازم تھی لیکن پھر بھی آپؐ نے اُس وقت بیعت لی جبکہ قتال کا مرحلہ آنے والا تھا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ہے۔ وہاں اصل جماعت تو اس بنیاد پر بن گئی تھی کہ اللہ کے رسول نے دعویٰ کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں

☆ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس مقام پر فلسفۂ شہادت کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے جو حکمتِ دین کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس پر آنجناب کا مفصل خطاب بعنوان ''قرآن کا فلسفۂ شہادت'' آڈیو کیسٹ کی صورت میں دستیاب ہے۔ اہل فکر کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

جس نے یہ مان لیا وہ اُس جماعت میں شامل ہو گیا جو ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ پر مشتمل تھی۔ جنھوں نے تسلیم کر لیا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، وہ آپؐ کی پیروی کریں گے، آپؐ کا حکم مانیں گے، آپؐ کی بات سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ لہٰذا وہاں آغاز میں بیعت کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ آپؐ نے بیعت آخری مرحلے پر لی، لیکن ہمارے پاس تنظیم کی بنیاد کے لیے کوئی متبادل اساس نہ حدیث میں ہے نہ قرآن میں اور نہ ہماری تیرہ سو برس کی تاریخ میں بیعت سمع و طاعت کے علاوہ کوئی بنیاد موجود ہے۔ اس کے لیے متفق علیہ روایت ہے جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))[۲۲]

''ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے اس بات پر کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو، خواہ ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں خواہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے، خواہ آپ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں۔ جنہیں آپ امیر بنائیں گے یا ذمہ داری سونپیں گے ہم ان سے جھگڑے گے نہیں (ان سے تعاون کریں گے اور ان کی اطاعت کریں گے) جہاں بھی ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے (اپنی رائے ضرور پیش کریں گے)۔ ہم اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ (اس خوف سے کہ لوگ ملامت کریں گے یا مذاق اڑائیں گے ہم اپنی زبان بند نہیں کریں گے)''۔

یہ ہے حزب اللہ (یعنی اللہ کی پارٹی) جس کے بارے میں فرمایا گیا ﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ (المجادلہ) نیز فرمایا ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ (المائدۃ) گویا حزب اللہ سے دنیا میں غلبے کا بھی وعدہ ہے (اگر یہ شرائط پوری کی ہوئی ہوں) اور اس حزب اللہ سے آخرت کی فلاح کا وعدہ بھی ہے۔ سورۃ المجادلہ میں اس فلاح کا ذکر ہے اور سورۃ المائدہ میں غلبے کا ذکر ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے جو بیعت سمع و طاعت لی تھی وہ غیر مشروط اور مطلق تھی لیکن آپؐ

کے بعد اس بیعت سمع وطاعت میں ''فی المعروف'' کا اضافہ ہوگا۔اس لیے کہ حضور ﷺ کی اطاعت مطلق اطاعت تھی کہ جو حکم بھی آپ دیں گے اس کی بلا چون و چرا اطاعت کرنی ہو گی۔اس لیے کہ آپؐ سے غلطی کا صدور ممکن نہیں، آپؐ معصوم ہیں اور جو کچھ آپؐ پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے آپؐ وہی کچھ کرتے اور کہتے تھے۔از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۝﴾ (النجم)

''اور وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے''۔

اگر کوئی دنیاوی تدبیر ہوتی تو اس میں حضور ﷺ ساتھیوں سے مشورہ لیتے۔بعض مواقع پر ساتھی خود عرض کر دیتے کہ اگر آپ کی رائے وحی پر مبنی ہے تو سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا، اور اگر یہ آپ کا ذاتی اجتہاد ہے تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجیے۔حضور ﷺ فرماتے کہ ہاں اپنی رائے بیان کریں۔لیکن جس بات کا آپؐ حکم فرما دیتے اس پر سب سر تسلیم خم کر دیتے کیونکہ وہ تو ہر حال میں ماننا ہے۔لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی یہ مقام نہیں ہے کہ وہ کہہ سکیں کہ میں جو حکم بھی دوں گا وہ ماننا پڑے گا۔حضور ﷺ کے بعد اصول یہ ہوگا کہ کتاب وسنت کے دائرے کے اندر اندر حکم ہوگا تو مانا جائے گا۔اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر حکم دیا جائے گا تو ٹھیک ہے اس سے باہر قابل قبول نہیں۔اسلامی ریاست کا سیاسی نظام بھی بنے گا تو اسی دائرے کے اندر اندر، اور کوئی جماعتی نظام بنے گا تو وہ بھی اس دائرے کے اندر اندر۔ چنانچہ ہم نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جو حلف نامہ رکھا ہے وہ اسی حدیث پر مبنی ہے۔لیکن اس میں ''فی المعروف'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔یعنی ''اِنِّیۡ اُبَایِعُكَ عَلَى السَّمۡعِ وَالطَّاعَةِ فِی الۡمَعۡرُوۡفِ ...... الخ

ظاہر بات ہے بیعت سمع وطاعت اُس جماعت کی بنیاد ہے جو اقامتِ دین کی سطح پر یعنی تیسری منزل پر جہاد فی سبیل اللہ کا کام کرنا چاہے۔جیسا کہ عرض کیا گیا، بیعت سمع و طاعت کا یہ نظام ''منصوص'' بھی ہے، یعنی قرآن وحدیث کی نص (text) سے ثابت ہے، ''مسنون'' بھی ہے، یعنی سنت نبویؐ سے ثابت ہے اور ''ماثور'' بھی ہے۔امت کا اس پر

تعامل رہا ہے۔ تیرہ سو برس کی پوری مسلم تاریخ میں ہر اجتماعی کام شخصی بیعت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے ہاتھ پر شخصی بیعت ہوئی، پھر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر شخصی بیعت ہوئی۔ اور جب خلافت غلط رخ اختیار کر رہی تھی تو اس کا رخ درست کرنے کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ میدان میں آئے تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوفیوں نے بیعت توڑ دی۔ اس کا کوئی وبال (معاذ اللہ) حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر نہیں ہے۔ عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما اٹھے تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ پھر ہمارے ہاں خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی تو بھی بیعت کی بنیاد برقرار رہی۔ تصوف میں تزکیۂ نفس کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ بھی بیعت ارشاد ہی کی بنیاد پر چلا۔ پچھلی صدی میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف عالم اسلام میں مزاحمت کی تحریکیں اٹھیں تو وہ سب بیعت کی بنیاد پر ہی تھیں۔ چاہے وہ سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک تھی، یا لیبیا میں سنوسی کی تحریک تھی، یا ہندوستان میں تحریک شہیدینؒ تھی۔

موجودہ دور میں مغربی اثرات کے تحت بالعموم شخصی بیعت کی بجائے دستوری بیعت کا نظام اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی جماعت کا ایک دستور لکھا ہوا موجود ہے اور آپ کی بیعت اس دستور سے ہے کہ آپ اس دستور کی پابندی کریں گے اور اس دستور کی رو سے جو امیر ہوگا اس کی بات مانیں گے۔ یہ دستوری بیعت ہے، جسے مَیں جائز اور مباح سمجھتا ہوں، لیکن میرے نزدیک منصوص، مسنون اور ماثور 'شخصی بیعت' اس دستوری بیعت سے بدرجہا بہتر ہے۔

دو اہم باتیں

اب آخری دو باتیں نوٹ کر لیجیے:

(۱) پہلی دو منزلوں کے جہاد کا جہاد فی سبیل اللہ ہونا اس شرط سے مشروط ہے کہ ہدف تیسری منزل ہو۔ اگر پیشِ نظر اقامتِ دین نہیں ہے تو پھر یہ چیزیں جہاد فی سبیل اللہ شمار نہیں ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ پہلی منزل پر تزکیۂ نفس خانقاہی نظام بن کر رہ جائے اور بس تزکیہ اور تربیت کا یہی عمل نسلاً بعدَ نسلٍ چلتا رہے۔ اسی طرح اگر دعوت و تبلیغ کا ہدف بھی ''اقامت دین'' نہیں ہے تو پھر یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے کھاتے میں شمار نہیں ہوگی۔ ع

آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

لٰہذا آغاز ہی سے ہدف اقامت دین اور غلبہٗ دین ہونا چاہیے۔ ابتدا ہی سے یہ ہدف سامنے رہنا چاہیے۔اس لیے کہ ساری جدوجہد منزل بہ منزل اسی کے لیے ہورہی ہے۔

(۲) جب کوئی بندۂ مؤمن غلبہ طاغوت کے تحت زندگی گزار رہا ہو تو اس کی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں؟ آج پوری کی پوری امت کا حال یہ ہے کہ وہ طاغوت اور باطل کے غلبے کے تحت زندگی گزار رہی ہے، اِلّا ماشاءاللہ، کچھ pockets ہیں جو اس سے مستثنٰی ہیں۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ افغانستان میں اسلامی حدود وتعزیرات کا نفاذ ہوا ہے یا کسی حد تک سعودی عرب، ایران اور سوڈان میں اپنے اپنے فقہی تصورات کے مطابق اسلامی قوانین نافذ کئے گئے ہیں، باقی پوری امت مسلمہ طاغوت کے شکنجے میں ہے۔ چاہے سو فیصد مسلمان آبادی ہے لیکن نظام کافرانہ ہے۔ایسی صورت حال میں قرآن☆ کا فیصلہ یہ ہے کہ ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ﴿۴۴﴾ ...... فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۴۵﴾ ...... فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴿۴۷﴾﴾ یعنی جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں......وہی تو ظالم ہیں......وہی تو فاسق (نافرمان) ہیں۔ بقول اقبال ؔ

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی!
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

اس حالت میں اگر اس طاغوت کا انکار نہیں ہے، اس سے شدید نفرت نہیں ہے، اس کے خلاف جہاد کا عزمِ مصمم نہیں ہے اور اللہ کے دین کے غلبے کی جدوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا گیا تو پھر یہ زندگی میرے نزدیک نفاق کی زندگی ہے۔ پھر اس باطل نظام کے تحت پھلنا، پھولنا، اپنی جائیدادیں بنانا اور کاروبار چمکانا جائز نہیں ہے۔ایسی حالت میں بندۂ مؤمن اور کچھ نہ کرے لیکن Under protest ضرور رہے' کیونکہ وہ مجبور ہے۔ وہ ان حالات میں ایک مجاہد کی حیثیت سے رہے اور مسلسل جہاد کرتا رہے۔کم سے کم درجے میں

☆ سورہ المائدہ آیت 40 تا 50 میں یہ مسئلہ تفصیل سے زیر بحث آیا ہے محولہ بالا آیات اسی سلسلہ کلام میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ قرآن حکیم کا عجیب سحر انگیز مقام ہے۔اس کا توجہ سے مطالعہ کرنا چاہئے۔

اس نظام سے شدید نفرت تو ہو، اس کے ساتھ ہم آہنگی نہ ہو، اس نظام کی خدمت نہ کی جائے، اس کی چاکری نہ کی جائے، اس کے ساتھ مصالحت (Reconciliation) نہ ہو، بلکہ ایک جدوجہد ہو اور انسان یہ سمجھے کہ یہ میرے لیے فرضِ عین ہے۔ یہ جہاد بندۂ مؤمن پر فرضِ عین ہے۔ اس جہاد کے بغیر نجات نہیں ہے اور اس جہاد کے بغیر ایمان نہیں ہے۔ یہی وہ جہاد ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰی اَنْ يُّقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدَّجَّالَ))(۲۳)

’’جہاد (فی سبیل اللہ) جاری ہے اس دن سے لے کر جس دن اللہ نے مجھے مبعوث کیا تھا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب میری اُمت کا آخری حصہ دجال کے ساتھ جنگ کرے گا‘‘۔

چنانچہ نوٹ کیجیے، بارہ برس مکے میں جو جہاد ہوا وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا، قتال تو کہیں پندرہ برس بعد جا کر میدانِ بدر کے اندر ہوا ہے۔ پہلے جہاد حضور ﷺ نے تن تنہا کیا پھر آپؐ پر ایمان لانے والے آپ کے ساتھیوں نے یہی جہاد کیا۔ بارہ برس صبرِ محض (Passive Resistance) میں گزرے ہیں تو اس دوران بھی جہاد فی سبیل اللہ منزل بمنزل آگے بڑھتا رہا ہے اور پھر اقدام (Active Resistance) کا ایک دو سال کا عرصہ ہے اور پھر جا کر مسلح تصادم (Armed Conflict) یعنی قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آیا ہے۔

بہرحال جہاد فی سبیل اللہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب اُمت کا آخری حصہ دجال کے ساتھ جنگ کرے گا۔ دجال کے ساتھ جو جہاد ہوگا وہ جہاد کی آخری منزل یعنی قتال ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑی جنگ ہوگی جسے حدیث میں ’’اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی‘‘ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ مرحلہ بھی اب کوئی زیادہ دور نہیں ہے اس کیلئے عالمی سطح پر سٹیج تیار ہو رہا ہے اور اس کیلئے سارے عوامل دیکھنے والوں کو نظر آ رہے ہیں۔

یہ ہے جہادِ مسلسل، جہدِ مسلسل، جہاد فی سبیل اللہ کی فرضیت اور لزوم، اس کی منزلیں، اس کے مراحل اور اس کے لوازم۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُاللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

تخریج احادیث

۱) مسند احمد ۱۳۰/۴۔ سنن الترمذی (ح۲۸۶۷)، کتاب الامثال، باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

۲) سنن ابی داوٗد، (ح ۲۵۳۲)، کتاب الجهاد، باب فی الغزو مع ائمۃ الجور

۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب قول النبیﷺ بنی الاسلام علی خمس۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ارکان الاسلام۔ سنن الترمذی (ح۲۷۳۶) کتاب الایمان، باب بنی الاسلام علی خمس۔ سنن النسائی (۱۰۷/۸) کتاب الایمان، باب علی کم بنی الاسلام۔

۴) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان۔ سنن الترمذی (۹ح ۲۱۷۳) کتاب الفتن، باب ما جاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب۔ سنن ابی داوٗد، (ح ۱۱۴۰)، کتاب صلاۃ العیدین، باب الخطبۃ یوم العید۔ سنن النسائی (۱۱۱/۸) ، کتاب الایمان ، باب تفاضل اهل الایمان، ولفظه : ((من رای منکم منکرا فغیره بیده فقد بری، ومن لم یستطع ان یغیره بیده فغیره بلسانه فقد بری، ومن لم یستطع ان یغیره بلسانه فغیره بقلبه فقد بری، وذلك اضعف الایمان)) واخرجه ابن ماجه (ح۴۰۱۳) فی الفتن، باب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر۔

۵) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنکر عن الایمان۔

۶) صحیح البخاری، کتاب المظالم، باب من قاتل دون ماله۔ سنن الترمذی (ح ۱۴۱۹او ۱۴۲۰)، کتاب الدیات، باب ما جاء فی من قتل دون ماله فهو شهید۔ **ودیگر کتب حدیث۔**

۷) رواه الدیلمی، بحواله کنز العمال، ۲۶۹/۴ سلسلة الاحادیث الصحیحة : ۱۴۹۶

۸) رواه البیهقی فی "دلائل النبوۃ"، بحواله مشکوٰۃ المصابیح (ح ۶۲۷۹) باب ثواب هذه الامة ، الفصل الثالث۔

۹) صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب زیارۃ المرأۃ زوجها فی اعتکافه۔ **اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔** صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انه یستحب لمن روی خالیا بامراۃ وکانت زوجته او محرما له ان یقول : هذه فلانة، لیدفع ظن السوء به۔ سنن ابی داوٗد، کتاب الصیام، باب المعتکف یدخل البیت لحاجته۔

۱۰) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة الایمان۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه المسلم ما یحب لنفسه۔ ووافقهما الترمذی والنسائی۔

۱۱) رواہ البیہقی **بحوالہ** خطبات الاحکام لجمعات العام **مؤلفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ۔**

۱۲) الکامل فی التاریخ لابن اثیر، انساب الاشراف للبلاذری

۱۳) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منٰی **اور دیگر متعدد مقامات۔** صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ **ودیگر کتب حدیث۔**

۱۴) رواہ الدارمی۔عن الحسن البصری مرسلاً۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح (ح۲۴۹) کتاب العلم، الفصل الثالث۔

۱۵) سنن الترمذی، (ح۲۱۶۸)۔ کتاب الفتن، باب فی لزوم الجماعة۔ وفی بعض النسخ : ((یَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ))

۱۶) سنن الترمذی (ح ۲۱۶۶)، کتاب الفتن، باب فی لزوم الجماعة

۱۷) سنن دارمی،مقدمه،باب فی ذهاب العلم

۱۸) **حدیث پہلے گزر چکی ہے۔حوالہ کے لیے دیکھئے حاشیہ نمبر۱**

۱۹) سنن النسائی (۱۴۴/۷)، کتاب البیعة، باب هجرة البادی۔

۲۰) صحیح مسلم (ح۱۹۱۰) کتاب الامارة، باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔ سنن ابی داوُد، (ح ۲۵۰۲) کتاب الجهاد، باب کراهیة ترك الغزو۔ سنن النسائی (۸/۶) کتاب الجهاد، باب التشدید فی ترك الجهاد۔ مسند احمد۳۷۴/۳۔

۲۱) صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة، وکتاب الجهاد، باب تمنی الشهادة، وباب الجعائل والحملان فی السبیل۔ صحیح مسلم (ح۱۸۷۶) کتاب الامارة، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله۔ الموطا (۴۶۹/۱) کتاب الجهاد، باب الشهداء فی سبیل الله۔ سنن النسائی (۲۰/۶) باب درجة المجاهدین فی سبیل الله عزوجل۔

۲۲) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس۔ صحیح مسلم (ح۱۷۰۹) کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة۔ الموطا (۴۴۵/۲، ۴۴۶) کتاب الجهاد، باب البیعة علی السمع والطاعة۔ سنن ابن ماجه (ح۲۸۶۶) کتاب الجهاد، باب البیعة۔

ب۲۳) حدیث پہلے گزر چکی ہے۔حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیے حاشیہ نمبر۲